رجسٹرڈ نمبر ایل ۶۶

نگار

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے وادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حُسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصۂ اول

اڈیٹر نگار کے تمامتر خطوط جو جذبات نگاری و سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے ساتھ خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز (حصۂ دوم)

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب نقادی حیثیت رکھتے ہیں وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہو انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ مختصر تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

فروری کا "نگار" علٰحدہ شایع نہیں ہوا، بلکہ جنوری ہی کی اشاعت میں شامل تھا

نگار

مدیر خصوصی: نیاز فتحپوری

جلد ۱۵	فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۴۷ء	شمار ۳

ملاحظات ---------- ۲
ادب میں شخصیت --- فوق ---------- ۵
کعبہ اور کاشی --- نظیر حمیلی (ام، اے) ---- ۱۰
اقبال اور اسلام کے اولین اصول --- شوکت سبزواری - ۲۶
مکتوبات نیاز ---------- ۲۵
قدیم سنسکرت لٹریچر --- ا - ح ---- ۳۹
استفسارات ---------- ۴۸
مالہ وماعلیہ ---------- ۴۸
دیر و حرم (نظم) --- سیدہ اختر ---- ۵۲
نوائے جبریل (نظم) --- ماہر القادری - کلام نسریں --- ۵۳
نفس اعتبار (نظم) --- شمیم نعمانی ---- ۵۴
غزل --- حرمت الاکرام ---------- ۵۴
بیاض نیاز --- (حالی) ---------- ۵۵
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۷

دو ڈرامے اڈیٹر نگار کے قلم سے

جھانسی کی رانی

اور

اصحاب کہف

جو حال ہی میں شایع ہوئے ہیں

دونوں کی قیمت معہ محصول چار روپیہ آٹھ آنے (للعہ ۸)

فلسفۂ مذہب اور مذہب

دونوں دو روپیہ میں (عہ)

معہ محصول

نقشہائے رنگ رنگ

غالب کے فارسی کلام پر تبصرہ، اڈیٹر نگار کے قلم سے

توقیت

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر

عہد مغلیہ تک تمام اہم واقعات کا تاریخوار تذکرہ

اڈیٹر نگار کے قلم سے

دونوں کتابیں ایک روپیہ کے ٹکٹ آنے پر

ملسکتی ہیں

وی، پی نہیں جائے گا

منیجر "نگار" لکھنؤ

ملاحظات

آیندہ نظامِ تمدّن کیا ہونا چاہئے

دور و تسلسل منطقی حیثیت سے محال ہو یا ممکن، لیکن حیاتِ انسانی کے تنگ و غیر واضح زاویۂ نگاہ سے نظامِ عالم کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ وہی صبح، وہی شام، وہی رات، وہی دن — ایک ہی آموختہ ہے جو روز دُہرایا جاتا ہے، ایک ہی ورق ہے جو بار بار اُلٹا جاتا ہے، یہاں تک کہ زندگی بے آب و رنگ سی نظر آنے لگتی ہے اور ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں گویا ہمارا وجود بے معنی ہے اور زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں — یہ حال ہے اس سرزمین کا جہاں آفتاب طلوع ہوتا ہے، لیکن وہ حصۂ زمین جہاں آفتاب غروب ہوتا ہے، اس سے بہت مختلف ہے۔ وہاں کا معیارِ زندگی وقت نہیں بلکہ حرکت و عمل ہے صبح و شام نہیں بلکہ جہد و اقدام ہے وہاں، نہ طلوعِ آفتاب کا کوئی مفہوم ہے، نہ غروبِ آفتاب کا۔ وہ جب چاہتے ہیں دن کو رات بنا لیتے ہیں اور رات کو دن۔ نہ اُن کو حوادثِ طبیعی کی فکر ہے، نہ موانعِ قدرت کی پروا۔ وہ ہواؤں کو پھاڑ کر فضاؤں کا سینہ چیر چیر آگے بڑھ رہے ہیں اور اس کرۂ ارض کا ہر نشیب و فراز ان کی دسترس سے قریب ہے۔ آسمان کی کوئی برکت ایسی نہیں جو انھیں حاصل نہ ہو، زمین کی کوئی دولت ایسی نہیں جو انھیں میسر نہ ہو۔ الغرض مشرق و مغرب کے انسان میں وہی فرق ہے جو طلوع و غروب میں اور بظاہر خواجگی و بندگی کا یہ فرق بڑا افسوسناک و عبرت آموز ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مغرب کا انسان کیا انسانیت کے لحاظ سے بھی کوئی بلند مرتبہ رکھتا ہے اور اگر مشرق کا انسان کچھ نہ کرنے کے بعد اپنی انسانیت کو کھو چکا ہے تو کیا مغرب کا انسان سب کچھ کرتے ہوئے بھی اپنی انسانیت کو قایم رکھ سکا ہے ——

اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں، اس میں شک نہیں کہ مغرب کی علمی ترقیاں، اس کا صنعتی عروج، اس کا بلند معیارِ زندگی ہر شخص کو یہی سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہاں کا ہر انسان بڑا کامیاب انسان ہے، لیکن اگر تکمیلِ انسانیت کے لئے سکونِ نفس اور اطمینانِ ضمیر بھی ضروری شرط ہے، تو شاید مغرب کے انسان سے زیادہ ناقص اسوقت کوئی انسان نہیں۔

وہ سمجھتا ہے کہ انسان صرف دولت جمع کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور اس کی صنعت، تجارت اور علمی جد و جہد سب کا مقصود یہی ہے، چنانچہ اس آرزو کی تکمیل کے لئے اسے خود اپنے ابنائے جنس کو تباہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور انسانی آبادی کا بڑا حصہ بدستور پریشان و مفلوک الحال رہتا ہے۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ طبقۂ عمال میں اب کافی بیداری پیدا ہو گئی ہے اور سرمایہ دار جماعت کا اب ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، لیکن اس کا کوئی مفید نتیجہ اس وقت تک نہیں نکل سکتا، جب تک انسانی زندگی سے متعلق دُنیا کا موجودہ معاشی نظام بدل کر اخلاقی نظام نہ قایم کیا جائے۔

دُنیا کی تاریخ میں صرف مذہبی اداروں ہی کی قایم کی ہوئی حکومتوں میں اخلاقی پہلو کی جھلک نظر آتی ہے لیکن وہ بھی آخر کار ناکام رہے، کیونکہ اولی تو ان کے سامنے بھی صرف ایک مخصوص جماعت یا قوم کا مفاد پیش نظر رہتا تھا اور ساری انسانی برادری ان کے سامنے نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اخلاق کی ضرورت ان کے یہاں زیادہ تر آیندہ زندگی سے متعلق تھی اور ہماری دنیاوی زندگی کو اس سے کوئی فایدہ نہیں پہونچ سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب جماعتی نظام کو بھی درست نہ رکھ سکا اور وہ افراد بھی جو ایک ہی انداز سے ایک ہی معبد میں عبادت کیا کرتے تھے آپس میں دنیاوی اغراض کے تصادم کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔

بہر حال اس وقت تک جتنے نظام دُنیا میں ہو چکے ہیں وہ سب کے سب آخر کار ناکام رہے اور ان سب میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور دُنیا کا کوئی نیا نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک جماعتی اغراض و مفاد سے قطع نظر بین الاقوامی نقطۂ نظر کو سامنے نہ رکھا جائے اور اخلاق پر اس کی بنیاد قایم نہ کی جائے۔

اس وقت دُنیا کے تمام مفکرین و ارباب سیاست اس امر پر متفق ہیں کہ دنیا کا کوئی نظام اگر کامیاب ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی نظام ہے، لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اگر اس معاشی نظام کا مقصود بھی محض تجارتی ترقی و مادی مفاد قرار دیا گیا تو یہ بھی کامیاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس طرح جذبۂ مسابقت بدستور قایم رہے گا اور ایک قوم دوسری قوم سے برسر پیکار رہے گی۔

معاشی نظام اس میں شک نہیں، تنہا نظام ہے جو دُنیا میں امن و سکون قایم رکھ سکتا ہے، لیکن اس کی بنیاد بھی اخلاق پر قایم ہونا چاہئے اور اس میں اسی وقت کامیابی ہو سکتی ہے جب ذاتی نفع اندوزی کی راہیں بالکل مسدود کر دی جائیں اور بجائے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے، ایک دوسرے کے امداد کا جذبہ لوگوں میں پیدا کیا جائے۔

یقیناً یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے اور مغرب کے بعض سیاسی مفکرین نظریہ کی حیثیت سے اس کو پیش بھی کر چکے ہیں، لیکن عملی حیثیت سے دنیا میں سب سے پہلے روس ہی نے اس کا تجربہ کیا اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس وقت روئے زمین پر روس ہی تنہا وہ ملک ہے جہاں انسان اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

معاشی نظام کا تعلق بکلیہ ذرایع پیداوار سے ہے اور اس میں اخلاقی عنصر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب ان ذرایع کو بجائے مخصوص افراد کے قوم کی ملکیت قرار دیا جائے اور ہر شخص کی جسمانی و ذہنی ضرورتوں کا پورا کرنا حکومت کے ذمہ ہو۔ اس اصول پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب افراد سے خود ان کی ذات کا سوال اٹھ جائے گا تو وہ محنت نہیں کریں گے اور ایک مزدور یا نوکر کی طرح بیدلی سے اپنی خدمات انجام دیں گے۔ یہ اعتراض زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے، جن کے یہاں اخلاق کا مفہوم "اول خویش بعد درویش" سے زیادہ نہیں اور اول اول روس کی آبادی بھی اسی ریب و شک میں مبتلا تھی، لیکن بعد کو جب یہ بات ان کے ذہن نشین کر دی گئی

کہ صحیح اخلاق کا تعلق تو صرف دوسروں کی خدمت ہی سے ہے اور وہ جد وجہد بیکار ہے جس سے دوسروں کو فایدہ نہ پہونچے، تو وہ زیادہ جوش کے ساتھ کام کرنے لگے، یہاں تک کہ آج سوویٹ حکومت میں باہمی تعاون وامداد کا جذبہ اس قدر قوی ہے کہ اگر کسی بچّے سے پوچھئے کہ وہ کیوں تعلیم حاصل کر رہا ہے تو وہ یہی جواب دے گا کہ میں انسانی خدمت کے لئے علم حاصل کر رہا ہوں، اور اگر کسی کسان سے دریافت کیجئے تو وہ بھی یہی کہیگا کہ میں کھیتی اس لئے کرتا ہوں کہ میرے بھائی بھوکوں نہ مریں۔

روس کی موجودہ حکومت ۱۷ء میں قایم ہوئی ہے، لیکن اس تیس سال کی قلیل مدت میں وہاں کی ذہنیتوں میں حیرتناک انقلاب پیدا ہوگیا ہے، اور اب وہاں، صنعت، تجارت، سائنس اور زراعت سب قوم کے ہاتھ میں ہیں اور تمام ادارے اسی ایک اخلاقی جذبۂ تعاون کے ساتھ اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔

ان کی ترقیوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ مسابقت کے ذریعہ سے دُنیا کے بازاروں میں اپنی جگہ پیدا کرکے روپیہ کمائیں، بلکہ صرف یہ کہ اپنے ملک کا روپیہ خود افراد ملک ہی کے فلاح وبہبود پر صرف کریں۔ چنانچہ وہ سائنس سے کام لیکر صرف انھیں اختراعات وایجادات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جن کی خود ان کو ضرورت ہے اور کبھی ایسی اشیاء کی طرف توجہ نہیں کرتے، جن کا تعلق زندگی کے تعیشات سے ہے۔ سائنس کی ترقیاں یوروپ وامریکہ نے بھی بہت کی ہیں لیکن ان سب کا مقصود کسب زر ہے اور وہ صرف انھیں ایجادات کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں، جن سے ان کو روپیہ مل سکتا ہے ـــــ بہرحال جب تک دنیا کا معاشی نظام قابل اطمینان نہ ہوگا، موجودہ اضطراب دور نہیں ہوسکتا اور معاشی نظام بھی اسی وقت مفید ثابت ہوسکتا ہے، جب اسکی بنیاد اخلاق پر قایم کی جائے اور انفرادی یا جماعتی سرمایہ داری کو فنا کر دیا جائے۔

ہندوستان کے لئے بھی نیا نظام حکومت مرتب ہو رہا ہے اور ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی نوعیت کیا ہوگی لیکن یہ یقینی ہے کہ اگر وہ سوویٹ حکومت کے مماثل نہ ہوا، تو کامیابی مشکل ہے۔

مجوزہ غزنوی — (بقیہ صفحہ ۳ کالم ۲)

ہیں۔ دراصل غزنوی کے لئے اس صفت کا ثبوت محال ہے۔ اس سلسلہ میں اس دور کے مقابل ہیں سلجوقوں قسمتی ادوار کا کہ اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس قدر بڑھتی ہوئی ہے۔ اس کے ہوئے ہیں۔ اس کے ہوئے ہیں۔ اس کے ہوئے ہیں

ادب میں شخصیت

کسی ادبی تخلیق کو جانچنے کے لئے صرف یہی جاننا ضروری نہیں کہ ادیب کس فضا میں سانس لیتا ہے، اسکے زمانہ کا اقتصادی نظام کن بنیادوں پر قایم ہے، ذرائع پیداوار کیا ہیں اور جس طبقہ کا وہ فرد ہے اس سے وہ کیسے روابط رکھتا ہے۔ بلکہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس کے ذہن کی ساخت (Mental pattern) اور اسکی شخصیت کی تعمیر میں معاشی اثرات کے علاوہ اور کون سے مختلف عناصر کارفرما ہیں ۔۔۔ معاشیات کے پیچیدہ سلسلۂ عمل و ردعمل اور ہیئت اجتماعی پر اسکے وسیع اثرات نے نقادوں کے ایک گروہ کو یہ خیال کرنے پر آمادہ کر دیا ہے کہ معاشی نظام سے الگ ہٹ کر ادیب کی کوئی جداگانہ شخصیت ہی نہیں اور ادیب کی شخصیت اور اس کے ماحول کو واضح اور معین خطوط میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ نفس کی داخلی کیفیتیں اور ماحول کے خارجی اثرات ایک ہی شے کے دو نام ہیں، لیکن یہ نقطۂ نظر ممکن ہے ان ادیبوں کے لئے درست ہو جن کی آوازیں محض روحِ عصر (Time Spirit) کی صدائے بازگشت ہیں اور جو زمانہ کی رو کیساتھ بہتے رہنا ہی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ طریق فکر اس ادیب کے سمجھنے کے لئے صحیح نہیں ہو سکتا جس نے اپنا فلسفۂ حیات زمانے سے جنگ کرنا قرار دیا ہے نہ کہ زمانے کا ساتھ دینا۔ Structure of

ہم ادب میں جتنی ہی بڑی شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں اتنی ہی ہمیں اس کی ترکیب شعور (Consciousness) اور ذہنی کیفیتوں کا اندازہ کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ کیونکہ ہر بڑی ادبی شخصیت میں مختلف جذبات اور متنوع خیالات سے اثر پذیر ہونے کی حیرت انگیز صلاحیت پائی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے زمانے کے عقائد، تعصبات اور توہمات کو بجنسہ قبول کرنے کے لئے طیار نہیں بلکہ مشاہدات و تجربات سے کام لے کر خیالات کے دھارے کا رخ موڑ دینے کی قوت بھی اسے اپنے سے کم تر درجے کے ادیبوں سے ممتاز رکھتی ہے۔

ایک ہی اقتصادی نظام کے تحت ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرنے والے دو مختلف افراد کی ذہنیتوں میں بھی نمایاں فرق ہو سکتا ہے اور اس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں جن میں ایک سبب نسلی اثر بھی ہے کیونکہ آباء اجداد سے ورثے میں پائے ہوئے نسلی احساسات شخصی اظہار کی دوسری صورتوں کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی بہت اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

اسی طرح شخصیت کی تعمیر میں ایک اور اہم عنصر نوعی یا صنفی احساس بھی ہے اور جن مختلف رنگوں کی آمیزش سے ادیب کی ذہنی تصویر بنتی ہے ان میں یہ رنگ زیادہ شوخ نہ سہی، لیکن تمام رنگوں میں گھلا ملا ضرور ہے۔

اس کے علاوہ ادیب کا ذوقِ مطالعہ بھی خاص چیز ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے، کیونکہ خارجی ماحول کے ساتھ ساتھ کچھ اثرات اس ذہنی ماحول کے بھی ہوتے ہیں جن سے ادیب متاثر ہوتا ہے چنانچہ اقبال کا مشرق و مغرب کے مختلف فلسفیوں کے خیالات سے استفادہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت اسلئے زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ ابھی تک شخصیت کی تشکیل میں مطالعہ کی اہمیت تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ وہ لوگ جو ادیب سے کسی خاص لہجے کی توقع کرتے ہیں، انھیں سب سے زیادہ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر ادیب میں مطالعہ سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت نہیں تو اس کا پیش کردہ ادب بھی صحیح اثر اندازی سے محروم رہیگا۔ اینگلز ممکن ہے اپنے اس بیان میں صحیح ہو کہ اقتصادی نظام ہر معاشرت کی اصل بنیاد ہے لیکن اقتصادی نظام کسی فرد کو اس بات کا پابند نہیں کرتا کہ اس کی پروازِ خیال ایک مخصوص دائرے تک محدود ہو کر رہ جائے یا اس کا مبلغِ علم چند مصطلحات سے آگے نہ بڑھے۔

معاشی نقطۂ نظر سے نقد کرنے والوں کے لئے سب سے زیادہ ناقابلِ فہم امر ادیب کی انفرادیت ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح انسان ماضی یا مستقبل سے اپنا تعلق قایم کر سکتا ہے، جبکہ وہ ایک مخصوص نظام کے تحت زندگی بسر کرتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ان روایات سے کیوں وابستہ کر دینا چاہتا ہے، جن سے بظاہر اسکا کوئی معاشی علاقہ نہیں۔ اسے اپنے زمانہ کے ہنگامی واقعات کیوں متاثر نہیں کرتے۔ یا اگر متاثر کرتے ہیں تو وہ سماجی تعلق پر غور کرنے کے بجائے انھیں مشاہدۂ کائنات سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کیوں کرنے لگتا ہے۔ وہ انسانوں کے معاشی تعلقات پر نظر ڈالنے اور ان کی تبلیغ کرنے کے بجائے دوسری سچائیوں اور حقیقتوں کی جھلکیاں کیوں دیکھنے لگتا ہے۔ جب ادب محض سماجی روح کا عکس ہے تو وہ ہر شئے کو سماجی نقطۂ نظر سے کیوں نہیں دیکھتا۔ اسے کیا حق ہے کہ سماجی مسایل کو نظر انداز کر کے حسن، زندگی اور صداقت جیسے تجریدی مباحث پر گفتگو کرے۔

ایسے نقاد ادب میں صرف معاشی خرابیوں کی تصویریں اور اس سے مرتب ہونے والے اثرات دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ادب محض میکانکی عمل ہے سماج کا، حالانکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کا کوئی جواب نہیں کہ ہر زمانہ میں ادیبوں کی آوازیں ایک دوسرے سے اتنی مختلف کیوں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی واقعات سے بھرپور ہے اور ہمارے خیالات پر ان کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ مگر واقعات یکساں ہوتے ہوئے بھی مختلف ادیب ان سے مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اور اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارا اندازِ فکر بڑی حد تک ہماری طبیعتوں، ہمارے تجربوں، ہماری خواہشوں اور ہماری امیدوں کے تابع ہے۔ یہاں تک کہ خالص تجریدی مسائل جمال و خیر اور مظاہرِ فطرت کی تصویروں میں بھی ہماری ذہنی کیفیتیں ہی رنگ بھرتی ہیں۔

بائرن جن ستاروں کے متعلق کہتا ہے Ye, Stars which are poetry of heaven ان ہی ستاروں کے متعلق ایک اُردو شاعر کا خیال ہے: "یہ تمہارے، یہ کفن کے سرد پھول"

ذہنِ انسانی کیمیائی اجزا کی مانند نہیں کہ مقررہ صورتوں میں صرف مقررہ نتیجے ہی برآمد ہوں۔ انسانی زندگی کی قدریں خود اس کے تجربے اور عمل سے قائم ہوتی ہیں اور ہر شخص کا تجربہ ایک مخصوص معاشی نظام کے تحت بھی مختلف ہو سکتا ہے۔

انسانی محسوسات و تجربات کے نتائج ذہنی بھی مختلف ہو سکتے ہیں اس لئے ایک نقاد کا فرض صرف یہ نہیں کہ وہ یہ دیکھے کہ ادیب سماجی حالات سے کس حد تک متاثر ہوا ہے بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان خیالات کو کس طرح قبول کیا گیا ہے، ان محسوسات، مشاہدات یا تجربات نے ادیب کے ذہن پر کس طرح اثر ڈالا ہے، اور وہ رابطہ جو ادیب نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے منتخب کیا ہے اس میں حقیقی ترجمانی کی صلاحیت موجود ہے یا نہیں۔

آپ نے اکثر اسٹیشنوں پر دیکھا ہوگا کہ وزن کرنے کی مشین رکھی رہتی ہے اُدھر آپ نے مشین میں ایک آنہ ڈالا اُدھر آپ کا وزن آگیا اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ کی قسمت کے متعلق چند مقررہ شدہ پیشین گوئیاں بھی۔ ہمارے ان معاشی نقادوں نے تنقید کو بھی کچھ ایسا ہی بنا رکھا ہے۔ معاشی تجزیئے کی اکنی ڈالتے ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ زیرِ بحث ادیب کی ادبی حیثیت اور اس کی تخلیقات کیا وزن رکھتی ہیں۔

اگر واقعی تنقید اسی کا نام ہے اور اس کی راہ اتنی سہل اتنی یقینی اور اتنی ہموار ہے تو یہ کوئی ایسی مشکل چیز نہیں۔ مگر بالغ نظر نقاد زندگی کو مجموعی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ان تمام حالات کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، جن سے زندگی ترتیب پاتی اور شخصیت پہچانی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں لوگ ایک غلطی یہ بھی کرتے ہیں کہ ماضی کے اثرات اور ادبی روایات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حال بغیر ماضی کا سہارا لئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قدما کی مروجہ روایات، ہر خیال اور ان تمام تجربوں کو جو ادب میں ہیئت اور مواد کے لحاظ سے حاصل ہوئے ہیں ٹھکرا دیا گیا ہو۔ قدیم سے مکمل علحدگی محض فریبِ نفس ہے۔ شاید اسی لئے اقبال کہہ گئے ہیں:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک ، دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

الغرض تنقید ادبی مزاج اور ادبی روایات سے بیگانہ ہو کر محض اقتصادی اُصول کے سہارے زیادہ دور نہیں چل سکتی۔ اور وہ تنقید جس میں ادب سے حاصل کردہ تاثرات نہ شامل ہوں کبھی دیرپا اقدار کی حامل نہیں ہو سکتی۔ ماضی کے اثرات کے سلسلہ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعض اوقات کچھ تصورات ادیب کے ذہن پر اس شدت سے چھا جاتے ہیں کہ وہ حال کے ذہنی رجحانات سے غیر شعوری طور پر بے خبر ہو جاتا ہے۔ اگر تصور کو مادی حالات کا

پر تو مان لیا جائے تو بھی یہ غیر ممکن نہیں کہ ادیب اپنے زمانے سے وابستہ ہوتے ہوئے ذہنی طور پر کسی اور دور سے تعلق قایم کرلے یا کسی خاص تصور کو رومانی حیثیت سے اپنا بنالے۔

ایک ادیب کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ انسانیت کے ہزارہا سال کے تجربات کو ـــــ اپنے داخلی احساسات کے ساتھ ـــــ اس طرح پیش کرے کہ ایک ابدی صداقت کا احساس ہونے لگے۔ جدید علم النفس بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ہزارہا سال کے تجربات و تاثرات ذہنِ لاشعور میں محفوظ ہیں۔ آج سائنس کی روز افزوں ترقی کی بدولت فضائے اثیر سے لیکر بحرِ مواج کے طبقاتِ زیریں تک ہماری دسترس سے دور نہیں۔ لیکن ابتدائی عہد کے انسان کا تصور ہمیں بتاتا ہے کہ وہ مظاہرِ فطرت سے کس قدر مرعوب تھا۔ بادل، بجلی، آگ، پانی، دریا وغیرہ وہ تمام اشیاء جو اس کی سمجھ میں نہیں آتیں، اسکی نظر میں قوت و طاقت کا مخزن اور قابلِ پرستش ہوگئیں۔ اسے ہر لمحہ یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں اس بے کراں و بے پایاں کائنات کی وسعتوں میں اس کی ہستی ذرۂ حقیر کے مانند گم ہو کر نہ رہ جائے۔ اسی احساس کی گونج اقبال کے ان اشعار میں پائی جاتی ہے۔

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی، مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اس دشت و در کو میں

یہاں تاثر کی گہرائی خارجی کشمکش سے زیادہ اس خیالی کشاکش اور ذہنی کشمکش کی نمایندگی کرتی ہے جو اس نظامِ آفرینش کے متعلق غور و فکر کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن ان اشعار میں آفاقی وسعتوں کے شعور کے ساتھ ساتھ انانیت کا خوف زدہ احساس بھی شامل ہے۔ شاعر کی جن ذہنی کیفیتوں نے ان سروں کو چھیڑا ہے اس میں ابتدائی عہد کے انسان کی طرح جذبے کی سادگی باقی نہیں رہی ہے۔ انسانی زندگی روز بروز زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی ہے۔ یہ اشعار جن لرزتی ہوئی کیفیتوں کو بیدار کرتے ہیں ان میں تخیل کے بدلتے ہوئے رنگوں کی طرح مختلف نقوش پائے جاتے ہیں تہذیب و تمدن کی الجھنیں، معاشی و اقتصادی دشواریاں، فرد و جماعت کی کشمکش نئے فلسفیانہ نظریات اور وراثت میں پائے ہوئے عقاید سب ملکر، حقیقت، کی تلاش میں ذہنِ انسانی کی جد و جہد کی نارسائی کا تصور شاعر کے ذہن پر طاری کردیتے ہیں۔ گویا اس ایک جذبے کی انتقال پذیری ("Transference") کی صلاحیت سے مختلف فانوسِ خیالی جگمگا اٹھتے ہیں۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ادب میں موضوع کے اعتبار سے ہم آہنگی ہونے پر بھی طرزِ نگارش کا انداز ہمیشہ انفرادی رہتا ہے ـــــ اس طرزِ نگارش کے اثر سے وہ موضوعات جو ادیب کی شخصیت اور معاشی نظام کے روابط سے بیک وقت تعلق رکھتے ہیں کہیں سے کہیں پہونچ جاتے ہیں۔ حسن کاری محض سپاٹ حقیقت نگاری نہیں بلکہ فنکار کا اندازِ تصرف بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ معاشی نقاد انداز بیان کی اس انفرادیت کو

زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ موضوع کے مطالعہ کی آڑ لے کر اسلوب سے قطع نظر کر لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کی تراش خراش، فقروں کا ایک دوسرے سے ربط، جملوں کا پھیلاؤ، خیال کی ترتیب، صوتی مناسبت اور کہنے کا انداز ادیب کی انفرادی خصوصیت اور ذہنی کیفیت کی براہِ راست نمایندگی کرتے ہیں۔ کسی نقاد کا موضوعی مناسبت پر نظر ڈالنا اور اسلوبی اختلاف کو فراموش کر دینا، تصویر کا ایک رخ دیکھنے کے مترادف ہے۔

پھر چونکہ ادب کی طرح تخلیقی تنقید کو بھی ارتقائی مدارج طے کرنا ہے اس لئے تنقید کا دائرہ زیادہ وسیع ہونا چاہئے کسی ادب پارے پر غور کرتے ہوئے سماج اور فطرت کے ساتھ ساتھ ذہن کی مخصوص ساخت کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر تنقید فکری و تجرباتی عناصر کی مدد سے آگے بڑھتی ہے تو ہمارے نقادوں کی نظر کو محدود دائروں سے نکل کر زیادہ وسعت اختیار کرنا چاہئے۔

فوق

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے۔

مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے :-

ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

کعبہ اور کاشی

وہ ماحول جس میں میری آنکھیں کھلیں یکقلم تقویٰ و طہارت کا ماحول تھا، وہ فضا جہاں میرا ابتدائی تعلیمی زمانہ گزرا یکسر نماز و روزہ کی فضا تھی - ایسی آب و ہوا میں گھٹنوں چل کر جوان ہونے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایک کٹر قسم کا مذہبی بن گیا -- اسلام کی یہ تعلیم ہو یا نہ ہو لیکن میرا تو یہ عقیدہ تھا کہ ہر وہ فرقہ یا قوم جو اسلامی دائرہ سے باہر ہے، کافر و مشرک ہے اس معاملہ میں منطق و معقولیت کا ایک حرف بھی سننے کا روادار نہ تھا اور رفتہ رفتہ میری مذہبی خشونت کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک بار میرا ایک ہم سفر غیر مسلم ملاقاتی پیاس سے بے حواس ہو رہا تھا - میں نے تھوڑا پانی ایک لوٹے میں وضو کیلئے محفوظ کر رکھا تھا - مسافر نے بڑی لجاجت سے پینے کے لئے پانی مانگا - لیکن میں نے کہا میں اپنا لوٹا تمہارے ہاتھ میں نہیں دے سکتا، یہ میرے وضو کا پاک پانی ہے -- جب کسی راستے سے گزرتے ہوئے کوئی مندر سامنے آجاتا اور پوجا کے گھنٹوں کی آواز سنائی دیتی تو میں کانوں میں انگلیاں ڈال کر دل میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوا تیزی کے ساتھ آگے نکل جاتا - ان کی مذہبی معتقدات کا مضحکہ اڑانا اپنا ایمانی فرض سمجھتا تھا --- عمر کے کم و بیش بیس بائیس سال اسی تنگ نظری میں بسر ہوئے - یہ تو میں دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میری طبیعت مذہبیت کی اس گرفت سے بالکل آزاد ہو چکی ہے - ایسا ہو بھی نہیں سکتا - جو خیالات گوشت اور خون کے ساتھ مل کر عادات اور مزاج بن چکے ہیں ان سے نجات پانا کوئی آسان بھی نہیں -- ہاں یہ ضرور ہوا کہ ماحول کی تبدیلی، زندگی کے گوناگوں تجربات اور فکر و غور کی مدد سے مذہبی جنون کی وہ شدت بہت حد تک معتدل ہو چکی ہے - لیکن آج جو کچھ سنا اور دیکھا اس نے میرے خیالات کی دنیا میں تغیر عظیم برپا کر دیا ہے - ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ایک پردہ تھا جسے کسی نامعلوم ہاتھ نے سامنے سے سرکا دیا -

(۲)

گھر کی مالی حالت مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں جلد از جلد روٹی حاصل کرنے کی کوئی تدبیر کروں لیکن جنگی ملازمتوں کے علاوہ اور کوئی ملازمت ملنا آسان نہ تھی - میں جنگ میں حصہ لینا چاہتا نہ تھا - اس لئے نہیں کہ مجھے جاپانیوں یا جرمنوں سے کوئی ہمدردی تھی - نہیں، بلکہ ملک کی سیاست کچھ ایسے نازک مرحلہ سے گزر رہی تھی کہ اس وقت جنگ سے الگ رہنا ہی مناسب معلوم ہوا - لیکن حالات کی گرمی اس قدر تیز تھی کہ میرے ارادے برف کی طرح پگھلنے لگے - کچھ دنوں تو ایک

نواب صاحب کے یہاں اتالیقی کرتا رہا گو یہ چیز بھی میرے جذبۂ خودداری کے خلاف تھی۔ پھر جب نواب بہادر کلکتہ پر جاپانی حملہ کے خوف سے پٹنہ بھاگے تو دو چھوٹے بھائیوں، ایک بوڑھی ماں اور بیوہ بہن کے گویا دو روزہ فاقہ نے مجھے اپنے ایک قریبی عزیز کے دروازہ پر پہونچا دیا۔ وہ اس وقت چاول کی تجارت کر رہے تھے۔ بہ اکراہ مجھے آدھ من چاول اُدھار دینے پر راضی تو ہو گئے مگر اس شرط کے ساتھ کہ میں فوراً کسی بھرتی کے دفتر میں ملازمت کے لئے درخواست دیدوں اور چاول کا بھاؤ وہی ہوگا جو بازار کا ہے۔ یعنی روپے کے دو سیر۔ پہلی شرط تو شاید انھوں نے اس اندیشے کی بنا پر لگائی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے خاندان کا بار انکے سر آپڑے، دوسری شرط کی بنیاد خود ان کی تشریح کے مطابق ظلم نہیں بلکہ اخلاق پر تھی ۔ ان کا ضمیر یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ "تجارتی اخلاق" کے خلاف وہ میرے اور عوام کے درمیان کوئی رعایت روا رکھیں ---- میرے پاس اس منطق کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۳)

وردی پہنتے ہی میں ایک نیا آدمی تھا۔ میرے خیالات میں نمایاں تبدیلی ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اپنے عقیدۂ وطن پرستی کے خلاف اس وردی میں اپنے ان دوستوں کے سامنے کیسے جا سکوں گا جن کے ساتھ مل کر میں کبھی جیل جانے کے منصوبے بنایا کرتا تھا۔ کیا میں شرم سے زمین میں گڑ نہیں جاؤں گا۔ لیکن جب ایک اسٹیشن پر سریندر سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی جو اپنے پھٹے ہوئے کھدر کے ملبوس میں ایک تھرڈ کلاس کے ٹھسے ہوئے ڈبے میں گھسنے کی جد و جہد میں لگا ہوا تھا تو میں جھینپنے کی جگہ اپنے اندر ایک خاص احساس برتری محسوس کر رہا تھا، فوجی ملازمت میں کچھ ایسا ہی جادو ہے۔ میں اپنی رجمنٹ میں محاسب کے عہدہ پر مامور تھا۔ جہاں جہاں رجمنٹ سفر کرتی تھی مجھے بھی ساتھ ساتھ جانا پڑتا تھا۔ یہ ماننا پڑیگا کہ تجربات کی بوقلمونی حاصل کرنا ہو تو فوجی زندگی سے بہتر میدان دوسرا نہیں مل سکتا۔ نئی نئی فضاؤں کی سیر۔ دور دراز مقامات کا سفر۔ مختلف النوع رسم و رواج، مزاج و خیال رکھنے والے لوگوں سے ملاقات۔ میل جول، لطف و محبت، اور ابھی دل ایک جگہ کی زندگی سے آسودہ بھی نہیں ہونے پاتا کہ ؎ "جرس آواز می دارد کہ بربندید محملہا"۔ مدراس میں یک بہ یک یہ خبر ملی کہ کل رجمنٹ کلکتہ روانہ ہو رہی ہے وہاں دو روز ٹھہر کر لکھنؤ کی طرف کوچ ہوگا جہاں دو ماہ قیام کرنا پڑے یا شاید کچھ اس سے بھی زیادہ ـــــ میں تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد کلکتہ جا رہا تھا اس لئے روح ایک خاص انبساطی کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وطن لاکھ غربت کا سا برتاؤ کرے مگر انسانی فطرت کی بے حیائی کو کیا کہئے اس کی محبت کا دل سے نکال پھینکنا اس کے لئے ممکن نہیں ـــ قحط کا تباہ کن طوفان کلکتہ پر سے گزر چکا تھا ہم لوگ پروگرام کے مطابق دو روز یہاں رہ کر تیسرے دن لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ اپنی تاریخی عظمت اور تہذیبی نزاکت کی وجہ سے مجھے ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ شام کا وقت تھا۔ میں آصف الدولہ کے امام باڑہ کی طرف قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ دور کالج کے نوجوان طلباء کا ایک گروہ ٹیڑھی مانگ نکالے، گوری گوری

کلائیوں پر سیاہ فیتے کی گھڑیاں باندھے مصروف گلگشت تھا۔ کسی نے دور سے مجھے آواز دی ۔ "افسر صاحب" اور میرے پیچھے دیکھنے پر میری طرف ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ میں ٹھٹھک گیا۔ نزدیک آتے ہی اس آدمی کو کئی بار سر سے پاؤں تک دیکھ گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے یہ شکل کہیں دیکھی ہے۔ حافظہ ماضی کے اوراق سرعت کے ساتھ اُلٹتا جا رہا تھا۔ ایک لمحہ سے بھی کم عرصہ میں ہزاروں دیکھے ہوئے مقامات و مناظر کی تصویر دماغ سے گزر گئی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے ـــ "کیا بھول گئے" ـــ شاید میری بدلی ہوئی شکل آپ کو دقت میں ڈال رہی ہے ـــ یاد کیجئے نواب صاحب کا مکان۔ اس کے سامنے" ـــ اس کا اتنا کہنا تھا کہ سارا منظر ایک ساتھ دماغ میں آ گیا ارے یہ تو وہی سلیمان ہے جس کی چائے کی دوکان پر جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ گو میں تین ماہ سے زیادہ نواب صاحب کے ہاں نہ رہ سکا لیکن اس مختصر زمانے میں سلیمان سے کافی ربط پیدا ہو گیا تھا، آدمی ذہین ہونے کے علاوہ صاحب دل بھی تھا۔ چائے کی دوکان اور سلیمان کا ذہنی رجحان مجھے کچھ عجب بے جوڑ سی چیز معلوم ہوتی تھی۔ اتنا سلجھا ہوا دماغ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ـــ بے ساختہ جی چاہا کہ اس سے وطنی جوش کے ساتھ بغلگیر ہو جاؤں۔ لیکن میں ایک فوجی وردی میں تھا، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال آیا کہ میں اس کے چند بیسوں کا قرضدار بھی ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی میں کچھ جھینپ سا گیا لیکن اس وقت قرض ادا کرنے کا کوئی محل بھی نہ تھا۔ "سلیمان، تم یہاں کہاں، کہاں کلکتہ، کہاں لکھنؤ" "ہاں ۔۔۔۔ مگر آپ تو واقعی کوئی افسر معلوم ہو رہے ہیں ـــ کیا کانگرس کا خیال چھوڑ دیا؟ ۔ ہاں صاحب کوئی کہاں تک حوادث کا مقابلہ کرتا رہے۔ بعض لمحات انسان کی زندگی میں ایسے آتے ہیں کہ وہ ان پر قابو نہیں پا سکتا، پھر یہ کہ اپنی تکلیف ہو تو آدمی سہ جائے، بال بچوں کی مصیبت آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ آپ یہاں کب آئے ـــ" سلیمان کی ذہین نگاہیں فوراً سمجھ گئیں کہ میرا بدلہ ہوا حلیہ مفلسی سے زیادہ میرے عزم کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ لیکن زبان سے وہ میرے جذبات کی پوری رعایت کر رہا تھا ـــ "لیکن تم یہاں کب آئے" ـــ میں نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا ـــ "قحط کے دنوں میں تو آپ کلکتہ نہیں رہے ہوں گے"۔ سلیمان نے میرے سوال کا خیال نہ کرتے ہوئے دریافت کیا ـــ اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بولنے لگا ـــ "قحط کے المناک منظروں نے تو میرے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی آپ سے کیا کہوں، کتے اور آدمیوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کے سامنے فاقوں سے بلکتی ہوئی مخلوق آس لگائے کھڑی رہتی تھی، جب کوئی شخص اپنی پلیٹ سے ہڈی یا روٹی کا کوئی ٹکڑا ان کی طرف پھینک دیتا تھا تو خیف و لاغر کتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھوکی مخلوق بھی اس پر ٹوٹ پڑتی تھی۔ عورت اپنی عصمت اور مرد اپنی غیرت ایک ایک لقمہ کے لئے بیچتے پھرتے تھے مگر اس پر بھی یقین مانئے بھوک کی آگ بجھانے کو کچھ میسر نہ آتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ماں کی گود سے چھٹے دم توڑ رہے تھے لیکن فاقہ زدہ ماں کے سینہ میں اتنا دودھ بھی نہ تھا کہ وہ مرتے ہوئے بچے کے حلق میں ٹپکا سکتی ـــ" سلیمان یہ کہتے کہتے رو پڑا۔ مجھ سے بھی ضبط نہ ہو سکا ـــ "چائے کی دوکان مجھے بند کر دینا پڑی"۔ سلیمان نے آنسوؤں

سے بھری ہوئی آواز سنبھالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "بوڑھے باپ کی مسلسل علالت اور دو جوان بہنوں کی شادی میں بچا کھچا سرمایہ بھی نکل گیا — بہنوں کی شادی تو ہوگئی مگر بوڑھا باپ فاقوں کی مصیبت برداشت نہ کرسکا۔ میں کسی دوست کے ہاں کچھ قرض مانگنے کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ آکر دیکھا تو مریض باپ مرا ہوا پڑا تھا — بڑی تنگی سے بسر ہونے لگی — سوچا جا کر فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ ایک بھرتی کے دفتر میں گیا بھی، پھر خیال آیا جس حکومت نے اپنی رعایا کو فاقوں مرتے ہوئے دیکھا اور کچھ نہ کرسکی اس کا ساتھ دینا گناہ ہے — کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں بھر گئے ہوں گے، کیوں نہ میرے مکان پر تشریف لے چلئے، وہیں چین سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی —" سلیمان مجھے کمر سیدھی کرتا ہوا دیکھ کر بولا۔ میں شرم سے اندر ہی اندر کٹا جا رہا تھا۔ طبیعت کی خجالت ماتھے سے پسینہ بن کر ٹپکنے لگی۔ سلیمان سے نگاہیں ملانا دشوار تھا — "نہیں سلیمان ۔۔۔۔" "افسر صاحب، میں یہاں سلیمان نہیں۔ یہاں میرا نام محمد اکبر ہے۔ آپ مجھے اس نام سے پکاریں تو بڑی نوازش ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کوئی میرے اصلی نام سے واقف ہو۔" "خوب" میں نے تعجب اور مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور بولا: "میاں اکبر اس گھڑی تو مجھے اپنے گھر لے جانے پر اصرار نہ کرو۔ کل اس سے کچھ پہلے اس جگہ مجھ سے ملنا تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا — مگر چلتے چلتے یہ تو بتلاتے جاؤ یہ داڑھی تم نے کب سے چھوڑ رکھی ہے" سلیمان نے ہنسکر جواب دیا۔ "دنیا چھوڑنی نہیں چاہتا تھا اس لئے داڑھی چھوڑنا پڑی" — سلیمان کا یہ مبہم اور تمسخرانہ جواب کچھ میری سمجھ میں نہ آسکا۔

(۴)

"یہی میرا غریب خانہ ہے جہاں میں اور میری بیوی آشا پریم اور پیار سے زندگی کے دن گزار رہے ہیں" — محمد اکبر نہایت خوشبودار تمباکو کا بھرا ہوا حقہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے — میری بھویں سکڑ کر بیچ میں آگئیں — بیوی؟ — آشا؟ — یہ کیا معمہ ہے؟ — سلیمان کے تو کوئی بیوی وغیرہ نہ تھی۔ مست الست آدمی تھا۔ شاید عنفوان شباب میں کسی عورت سے عشق کر بیٹھا تھا، اس نے دھوکا دیا تو عورتوں سے کچھ بیزار سا رہنے لگا تھا۔ "افسر صاحب، اندر تشریف لے چلئے، آپ سے کیا پردہ ہے، میں اور آپ صرف ہموطن ہی نہیں میں آپ کو اپنا بزرگ اور بھائی بھی سمجھتا ہوں۔ پھر میں، پردہ وغیرہ کا کچھ ایسا قایل بھی نہیں۔ میری بیوی آپ سے مل کر بہت خوش ہوگی، کافی پڑھی لکھی عورت ہے اور نہایت روشن خیال، اردو تو کچھ ایسی صاف نہیں بولتی لیکن آپ تو بنگلہ بھی بول لیتے ہیں" میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی، سلیمان اور یہ کایا پلٹ — یہ تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ جب کوئی شخص پردیس میں آکر کچھ خوشحال ہو جاتا ہے تو ایک آدھ شام اپنے ایسے ہم وطنوں کی آؤ بھگت کرنا ضروری سمجھتا ہے جو اتفاقی طور پر اس شہر میں آپڑتے ہیں، ایسے موقعوں پر خلوص کم اور نمائش کا جذبہ زیادہ کام کرتا رہتا ہے، لیکن سلیمان کا یہ اصرار کہ میں اس کی بیوی سے بھی ملوں میری تمام نفسیات دانی اور فلسفیانہ مطالعہ و مشاہدہ کو چکر میں ڈالے ہوئے تھا۔ کیا حوادث کا اثر اگر بعض کو پستی میں گرا دیتا ہے تو کیا بعض کو بصیرت کی اونچائی بھی عطا

کر دیا کرتا ہے - یا یہ اس "جمالِ درونِ پردہ" کی فسوں کاری کا اثر ہے -

"سنتی ہو" - سلیمان نے آواز دی - "ذرا باہر آجاؤ، دیکھو یہی میرے کلکتہ کے وہ دوست ہیں جن کا ذکر میں نے تم سے کل کیا تھا - ان کی وردی پر نہ جاؤ، وردی میں بھی آدمی ہوتے ہیں" - ایک بیس بائیس سال کی سانولے رنگت کی عورت ماتھے پر سیندور کا ٹیکا لگائے دونوں کلائیوں میں ہندوانہ وضع کے کنگن پہنے سامنے آکھڑی ہوئی - دونوں ہاتھ جوڑ کر کچھ اس انداز کے ساتھ اس نے مجھے نمستے کہا کہ میں گھبرا سا گیا - مجھے یہ ظاہر کر دینے میں کوئی روک نہیں کہ شاید بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے بھی میں نے اتنا ہیجانِ قلب محسوس نہیں کیا ہوگا جتنا اپنے وطن کی اس کمزور عورت کے سامنے محسوس کر رہا تھا نفسیاتی مطالعہ میرا محبوب مشغلہ رہا ہے، عورت ہو یا مرد اس کے چہرے سے اس کے دل کی باتیں معلوم کر لینے کا خبط میری عادتِ ثانیہ بن چکی ہے - لیکن اس گھڑی آشا کے سامنے آنکھوں کو اوپر اُٹھانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی - وہ حسین یقیناً نہیں تھی لیکن اُس کے چھریرے بدن اور بکھری ہوئی لٹوں میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ میری ساری دلیری ساب ہو رہی تھی -

"آپ نے بڑی زحمت کی، بہت بہت شکریہ" - آشا نے بنگلہ زبان میں کہنا شروع کیا - "کل ان کی زبانی جب یہ سنا کہ آپ ان کے کلکتہ کے دوست ہیں اور یہاں آئے ہوئے ہیں تو مجھے آپ سے ملنے کا بڑا شوق پیدا ہوا - وطن اور ہموطنوں کی محبت بھی ایک ناقابلِ تشریح جذبہ ہے" - گفتگو کی سلاست مجھے یہ یقین دلانے کے لئے کافی تھی کہ آشا کوئی معمولی عورت نہیں - اس پر لہجہ کی ہلکی موسیقیت شراب کو اور دو آتشہ بنا رہی تھی - "کہئے قحط کے بعد کلکتہ کا اب کیا عالم ہے، میں نے تو کئی بار کوشش کی مگر وہاں جانے پر دل آمادہ نہیں ہوتا - اور اب میرا وہاں رکھا ہی کیا ہے" - یہ کہتے کہتے آشا کے لبوں سے ایک سرد آہ نکل گئی - آشا کی بلا تصنع اور جھوٹی شرم و حیا سے آزاد گفتگو نے میرے اندر ہمت پیدا کر دی - میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ "آخر آپ لوگ یہاں کب اور کیوں آئیں" - لیکن آشا کی نسوانی فراست نے جو بعض عورتوں میں غیر معمولی طور پر زیادہ ہوتی ہے یہ محسوس کر لیا کہ میں اس سے کچھ اس طرح کے سوال کرنا چاہتا ہوں جس کے لئے وہ طیار نہیں - اسنے فوراً گفتگو کا رنگ بدل دیا اور کہنے لگی، "لیجئے آپ کو آئے اتنی دیر ہو گئی اور میں نے آپ کو ناشتہ کے لئے بھی نہیں پوچھا" -

"نہیں اس کی کیا ضرورت ہے - آپ محبت سے دو میٹھی باتیں کر لیں میرے لئے یہی بہت ہے" - اس نے کہا "صرف میٹھی باتوں سے پیٹ بھر جایا کرتا تو آدمی فوج میں بھرتی ہو کر جان جوکھوں میں کیوں ڈالتا" - میں کچھ سٹ پٹا سا گیا - آخر سلیمان اور آشا کے اصرار سے کچھ کھانا ہی پڑا - پھر آشا سے بہ لجاجت بولا "اچھا آشا دیوی اس وقت تو اجازت دیجئے، فوجی غلامی معمولی غلامی سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر حاضر ہوں گا" - "کل آپ کا انتظار رہے گا" - سلیمان نے مونچھوں سے چائے کی نمی خشک کرتے ہوئے کہا - "موقع ملا تو ضرور آؤں گا - آپ کی اور آشا دیوی کی صحبت سے کلکتہ کی زندگی کا لطف آگیا"

آشا کی میز پر پڑی ہوئی بہت سی کتابیں اُس کی غیر معمولی ذہانت۔ اس کا گھریلو سلیقہ۔ اس کی گفتگو کا انداز اور وہ ایک خاص خوددارانہ تمکنت جو اس کی کھچی کھچی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی یہ تمام باتیں ایک معمولی عقل کے آدمی کو بھی یقین دلانے کے لئے بہت تھیں کہ آشا مونیورسٹی کی بعض تعلیم یافتہ لڑکیوں کی طرح "تعلیم زدہ" نہیں بلکہ واقعی تعلیم یافتہ ہے لیکن جو چیز میرے دماغ کو بھنور میں ڈالے ہوئے تھی وہ تھی سلیمان اور آشا کی ازدواجی زندگی — ایک ہندو تعلیم یافتہ لڑکی ایک ادھیڑ عمر، مفلوک الحال مسلمان — اگرچہ آشا اور سلیمان دونوں نے مجھے پھر آنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ ایسا نہ بھی کرتے تو بھی میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر اس دماغی اُلجھن سے نجات پانے کے لئے وہاں پہونچ ہی جاتا۔

(۵)

شام ہوتے ہی سلیمان کے گھر جا پہونچا اور آواز دینے پر آشا بولی: "اندر آجائیے، وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں بس اب آیا ہی چاہتے ہیں"۔ میں ذرا ٹھٹکا، جوان عورت، سونا گھر، لیکن آشا کے لہجہ میں کچھ ایسی بے تکلفانہ یگانگت تھی کہ میں کسی نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے گھر کے اندر پہونچ چکا تھا۔ ابھی پسینہ خشک کرنے کے لئے جیب سے رومال بھی نہ نکال سکا تھا کہ سلیمان بھی آپہونچے، نہ معلوم کیوں میں گھبرا سا گیا۔ میری نگاہیں سلیمان کے چہرے پر جم گئیں، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسکی غیبت میں میرا بے تکلفانہ گھر کے اندر چلا آنا اس کو ناگوار تو نہیں گزرا۔ لیکن اس کا چہرہ اس طرح صاف تھا جس طرح برس کر کھل جانے کے بعد آسمان۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "کچھ افسر صاحب کو کھلایا پلایا یا یونہی بیٹھی ہوئی ان کا دماغ چاٹ رہی ہو، میں تو ان کی بکواس سے پناہ مانگتا ہوں"۔ سلیمان نے آشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ سلیمان کا آشا سے یہ تمسخرانہ تخاطب مجھے نہایت بھلا معلوم ہوا۔ ان دو چھوٹے جملوں میں باہمی خلوص، محبت اور اعتماد کا سمندر بند تھا۔ "بکنے کے علاوہ دو ایک نقص تو ان میں اور اتنے تکلیف دہ ہیں کہ اگر آپ سنیں تو حیرت میں آجائیں"۔ سلیمان نے نہایت بے تکلفی سے آشا کی پیٹھ پر اپنا کوٹ ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے اندر خوبیاں نہیں ہیں لیکن وہ میں ان کے سامنے بیان نہیں کروں گا۔ عورت ہزار پڑھی لکھی ہو پھر عورت ہے، مرد تو اپنی تعریف سُنکر دل ہی دل میں مسکرا کر رہ جاتا ہے لیکن عورت اپنی تعریف سُن کر بہک جاتی ہے"۔ سلیمان کے اس جملہ میں کچھ ایسی سچائی تھی کہ میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ "ہو سکتا ہے ایسا عورت کی فطری سادگی اور معصومیت کی وجہ سے ہو"۔ میں آشا کی تالیف قلب کرنے کی غرض سے بول اُٹھا۔ سلیمان نے شاید میری تنقید سُنی نہیں۔ وہ ایک خیالی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ آشا کا چہرہ البتہ کھل پڑا۔ پان کی دو بڑی گلوریاں میری طرف بڑھاتے ہوئے سلیمان سے مسکرا کر بولی: "خیر صاحب، میری تعریف تو مجھے بگاڑ دیگی لیکن میرے عیوب تو آیندہ کی تنبیہ کے لئے مجھ سے کہہ دیئے جائیں"۔ "عیب یہی کہ کل گوشت میں نمک زیادہ پڑ گیا تھا۔ مینے ہلکی زبان میں شکایت کی، تم جھلا اُٹھیں۔ "مجھے تو ایسا ہی پکانا آتا ہے، میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں تو کسی دوسری کو لاؤ وہ برابر کا نمک دیا کرے گی"۔ "افسر صاحب، آپ ہی خدا لگتی کہئے۔ ایک صحیح دماغ کا آدمی یہی جواب دیگا۔ ان کا

ایک دوسرا جنون تو اور ایسا دلچسپ ہے کہ آپ سنیں تو ہنستے ہنستے لوٹ جائیں"۔" وہ بھی کہہ ڈالئے۔ دل کی ہوس دل میں کیوں رہ جائے"۔ آشا نے کچھ جھینپتے کچھ چڑچڑاتے ہوئے کہا۔" افسر صاحب، جب یہ بیمار ہوتی ہیں تو ان کا عالم دیکھنے قابل ہوتا ہے، میری تو گویا موت ہی آجاتی ہے، اپنے پرائے سب سے خفا، آپ کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی کسی بیمار کی عیادت کو آتا ہے تو وہ خلوص سے نہیں بلکہ محض تصنع سے آتا ہے۔ اس لئے آپ کو پسند نہیں کوئی اس طرح کی جھوٹی مزاج پرسی کو انکے پاس آئے، ایک رات تو میں کونین کی گولی لئے ساری رات سرہانے کھڑا رہ گیا۔ مگر اس اللہ کی بندی نے نہ کھانا تھی نہ کھائی" آشا یہ سب سن کر اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مگر سلیمان سارا قصہ مزے لے لے کر سنائے جا رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر ہم جنسانہ مسرت ہو رہی تھی کہ اگرچہ آشا اور سلیمان کا جوڑ کچھ صحیح جوڑ نہ تھا اور آشا کے مزاج کی شاعرانہ نزاکت سلیمان کے مزاج کی خشک دہقانیت سے کوئی لگاؤ نہ رکھتی تھی پھر بھی سلیمان، آشا سے مرعوب نظر نہ آتا تھا، لیکن میں ان خوش نصیب جوڑوں کی خانگی اور نجی زندگی کا راز معلوم کرنے کی قدرتی خواہش دبا نہ سکا۔ سلیمان سے مخاطب ہو کر بولا" اکبر بھائی ایک بات پوچھوں، برا تو نہ مانو گے"۔" تم بھی کیسی غیروں کی سی باتیں کرتے ہو، برا کیوں مانوں گا۔ فوج میں جانے کے بعد تو تم جیسے وہ آدمی ہی نہیں رہے۔ کیا وہ زمانہ بھول گئے، جب میری دوکان پر بیٹھے ایک ایک دو دو بجے رات تک اپنی محبت کا قصہ سنایا کرتے تھے"۔ سلیمان اس وقت اپنے بڑے بے تکلفانہ رنگ میں تھا۔ اس کا آہستہ آہستہ "آپ" سے نیچے اُتر مجھ کو "تم" سے مخاطب کرنا بھلا معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ میرے لئے ہمت افزا بھی ثابت ہوا"۔" میں پوچھنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔" میں ذرا ٹھٹھکا۔۔۔۔۔" یہی کہ تم نے آشا دیوی جیسی روشن خیال بنگالن سے کس طرح شادی کی۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی ہندوانہ تہذیب اور عقیدہ ایک مسلمان کی بیوی ہو کر بھی قایم رکھ سکیں۔ لیکن شاید انھوں نے اسلام قبول کر لیا ہوگا۔ محبت مذہب، و مذہب کیا جانے"۔" نہیں یہ اب تک اپنے دھرم پر قایم ہیں" سلیمان نے ایک جھٹکے کے ساتھ فوراً جواب دیا۔" اس سے میری گھریلو زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اللہ کو میری زندگی بنانی تھی ورنہ ان دیوی جیسی سے ملاقات ہی کیوں ہوتی۔ آپ کو سارا قصہ سننا ہو تو انھیں سے پوچھئے۔ یہ مجھ سے زیادہ اچھی طرح آپ سے بیان کر سکیں گی۔ لیکن ہاں۔ کہیں ہم لوگوں کو پولیس کے حوالہ نہ کر دیجئے گا"۔

(۶)

"انسانی قسمت کے سمندر میں اکثر ایسے جوار بھاٹے آیا کرتے ہیں، جو اس کی کشتیٔ حیات کو کہیں سے کہیں پھینک دیتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک گرہست آشرم کی بیٹھنے والی ہندو لڑکی اپنے دھرم پتی کی موت کے بعد ستی ہونے کی جگہ ایک مسلمان گھر میں زوجیت کے فرائض انجام دے رہی ہوگی۔۔۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جو آپ کی نظروں کے آگے ہے"۔ آشا نے یوں بولنا شروع کیا جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔" میں اصل میں راج شاہی کی رہنے والی ہوں۔ میرا اٹھارھواں سال تھا جب میری شادی ہوئی۔ آپ جانیے ہندوستانی عورت کا آنچل جس مرد کے ساتھ بھی باندھ دیا جائے وہ اسکا دیوتا

ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھے اپنے شوہر سے کبھی محبت نہ ہو سکی"۔۔۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔۔۔ "اس وجہ سے نہیں کہ سن رسیدہ یا بدشکل تھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ باتیں ہندوستانی عورت کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، بلکہ اس نے میرے ضعیف العمر باپ سے کچھ اس بے دردی کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ تلک کے وصول کئے جس نے ہمیشہ کے لئے میرے دل کا دروازہ بند کر دیا۔ میرا باپ اس غم سے اور جھک گیا۔ پاٹ شالہ کے ماسٹر کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے۔ یہ خیال میرے دماغ سے کسی طرح نہیں نکل رہا تھا کہ اس نے مجھ سے اس لئے شادی نہیں کی کہ یہ سوسائٹی اور مذہب کی رو سے اس پر فرض تھا یا اسے واقعی رفیقۂ حیات کی ضرورت تھی بلکہ اس لئے کہ وہ صرف روپوں کا حریص تھا اور اس کا دل صرف روپوں ہی سے محبت کر سکتا ہے۔ میں شاید اپنی ازدواجی زندگی کی مصروفیتوں میں اپنا غم بھول جاتی اور اپنی نفرت پر قابو پا لیتی لیکن میری شادی کو ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ کلکتہ میں لڑائی کی وجہ سے مہنگائی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور بڑھتے بڑھتے انھوں نے قحط کی صورت اختیار کر لی۔ ایک دن مجھے میرے باپ کا خط ملا کہ وہ میری ایک اور چھوٹی بہن کے ساتھ بڑی عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ باوجود کم علم ہونے کے میرا باپ بڑا خود دار اور غیرت مند تھا اور اپنے اصول کا سختی سے پابند۔ میں سمجھ گئی کہ حالات کچھ ایسی ہی ناہموار ہیں کہ اس نے بالکل اپنی فطرت کے خلاف ایک بیاہی ہوئی لڑکی کو ایسا خط لکھا ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے گڑگڑا کر یہ التجا کی کہ وہ ایک سو روپیہ میرے باپ کو منی آرڈر کر دے، اس نے انتہائی سخت دلی کے ساتھ یہ جواب دیا کہ وہ گورنمنٹ کو چاول سپلائی کرنے کا بیوپار کرنے والا ہے اور اسوقت اپنے پاس سے سو پیسے بھی الگ نہیں کر سکتا۔ ایک ہفتہ بعد مجھے اپنی ایک دوست کا خط ملا کہ میری بہن چند دن ٹائیفائڈ کا شکار رہ کر چل بسی اور اس سوگ میں میرا بوڑھا باپ در دروازہ بیچ کر لاٹھی ٹیکتا ہوا کسی طرف نکل گیا۔ اُس کی موت کی خبر مجھے لکھنؤ روانہ ہونے کے چار دن قبل ملی۔ میرے شوہر کا کاروبار زور شور سے چل رہا تھا، کلکتہ کی غریب مخلوق دانے دانے کو دم توڑ رہی تھی۔ جب بھوک کی لہر مٹانے کو کچھ نصیب نہ ہوتا تھا تو دس دس پندرہ پندرہ فاقہ کشوں کا گروہ سڑک کے کنارے پھینکے ہوئے کوڑے کُرید کُرید کر غذا حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے شوہر سے کہا۔ دیکھتے ہو غلہ کی گرانی سے غریب طبقہ کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ ایسا قحط تو شاید ہی ہندوستان کی تاریخ میں کبھی پڑا ہو۔ تم یہ بیوپار کرکے مہاپاپ کر رہے ہو، جس ایشور نے مُنھ چیرا ہے وہ دو وقت کھانا دے ہی دے گا، دو دم کے لئے اتنی دولت سمیٹ کر کیا کرو گے"۔ غصّہ سے اس کے چہرے کی نسیں تننے لگیں گرج کر بولا۔ "مالتی تمھاری حیثیت اس گھر میں زیادہ سے زیادہ ایک خدمتگار کی ہے۔ تمھارا کام میری خدمت کرنا ہے نہ کہ نصیحت۔ دن بھر پڑی پڑی تاول پڑھا کرتی ہو۔ ایک شام کھانے کی فکر کرنا پڑے تو معلوم ہو کہ دنیا کس مصیبت کا نام ہے۔ اپنی محنت سے کمانا کوئی پاپ نہیں۔ اگر میں یہ کام نہیں کروں گا کوئی دوسرا کرے گا۔ ہندوستان میں سرکار کے ہمدردوں اور ہوا خواہوں کی کمی نہیں، بڑی آئیں مجھے عقل سکھانے والی، ایشور کھانا دے گا"۔۔۔ وہ میرا منھ چڑھاتا ہوا بولا۔ "ایشور کھانا دیتا ہے تو اتنے لوگوں کو

کیوں کھانا نہیں دیتا جن کی ہمدردی میں تمھاری جان نکلی جارہی ہے"۔۔۔ میں پیچ و تاب کھاکر رہ گئی۔ ایک عورت اقتصادی اعتبار سے ہمیشہ مرد کی محکوم ہے۔ اگر آزاد جذبہ رکھے بھی تو رواج کی مضبوط زنجیروں کے سامنے کیا کرسکتی ہے۔ آپ سو تو نہیں رہے ہیں"۔۔۔ آشا مجھ کو اپنے جملوں کی معنویت میں کھویا ہوا دیکھ کر بولی۔۔۔ "بالکل نہیں آپ کی داستان خواب آور نہیں، خواب سے جھنجھوڑنے والی ہے"۔۔۔ تیسرے دن مجھے خبر ملی کہ میرا شوہر ایک ملیٹری گاڑی کے نیچے آگیا اور اسپتال پہونچائے جانے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔ تنہائی کی زندگی تو ایک طور پر مہینوں سے کاٹ رہی تھی۔ لیکن اس بے سہارا زندگی نے مجھے پہلی بار شوہر کی ضرورت محسوس کرائی۔ دن پہاڑ اور راتیں بھیانک معلوم ہونے لگیں۔ دل سے خوش تو شوہر کی زندگی میں بھی کبھی نہ رہی۔ اس وقت بھی نہ تھی۔ لیکن اس وقت صرف دلی اندوہ تھا، دُنیاوی فکر نہ تھی، اس وقت غم کے ساتھ زندگی کا بوجھ بھی دل پر آپڑا تھا۔ میرا نوکر گنیش رخصت لے کر دو دن کے لئے گھر گیا اور میری خوش بختی سے وہیں کالرے کا لقمہ بن گیا۔ میں نے سوچا دو تین دن اور یہاں رہ کر اپنے آبائی وطن راج شاہی چلی جاؤں گی، لیکن تقدیر کوئی دوسرا ہی سامان کررہی تھی۔

میرے شوہر کی حرام کی کمائی ایک لوہے کی الماری میں بند تھی۔ ہاں میں اسے حرام ہی کی کمائی کہوں گی۔ جو روپے اپنے غریب بھائیوں کی جائیں بھینٹ چڑھا کر خریدے گئے ہوں وہ حرام نہیں تو کیا حلال کہلانے کے مستحق ہیں۔ میں اسے کھولنا نہیں چاہتی تھی، مگر کھولنا پڑا۔ دیکھا تو ہزار ہزار کے دس نوٹ ڈوری سے بندھے الگ رکھے تھے۔ میں نے پانچ ہزار تو نکال کر الگ رکھ لئے۔ یہ میرے باپ کی گاڑھی کمائی کے روپے تھے۔ بقیہ پانچ ہزار ہاتھ میں رومال لپیٹ کر الگ سے اس طرح اُٹھائے جیسے کوئی مردے کی ہڈیاں اُٹھاتا ہو۔ مجھے ان روپوں میں سے ہزارہا بیماروں، ناداروں، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے بھوکے انسانوں کی آہ و کراہ سُنائی دے رہی تھی۔ میں یہ فیصلہ کرچکی تھی کہ اپنے شوہر کے جُرم کا کفارہ ادا کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ میں ان روپوں کو غریبوں کی سیوا کے لئے قحط امدادی فنڈ میں جاکر جمع کرآؤں۔ یہی ایک صحیح اور جائز مصرف ان روپوں کا میری سمجھ میں آسکا تھا۔ لیکن میں اس تلخ حقیقت کو آپ سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتی کہ جب ان روپوں کو اس نیت سے اُٹھایا تو طبیعت کو اس کے لئے آمادہ نہ پاسکی۔ اپنی ساری زندگی ایک لق و دق صحرا کی طرح سامنے آگئی جس میں ہر طرف سے بڑے بڑے ڈراؤنے غار نظر آرہے تھے، خیال ہوا مجھے بھی تو اب غریبی اور کس مپرسی کی اندوہناک زندگی بسر کرنا ہے۔ لے دے کر یہی پونجی بقیہ عمر کا سہارا ہے۔ اپنی مصیبتوں کا خیال نہ کرکے دوسروں کی مدد کرنا دھرم اور عقل کسی اعتبار سے درست نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ دوسرے ہی لمحہ میں دل کے کسی نامعلوم گوشہ سے یہ آواز زور زور سے بلند ہونے لگی کہ "مالتی تیری ان ناعاقبت اندیشیوں کی تہ میں جو چیز چھپی ہوئی ہے وہ صرف حبِ زر ہے۔ تیرا نفس ان روپوں کے لالچ میں پھنس کر طرح طرح کے حیلہ تراش رہا ہے۔ تجھے جس خباثت کی وجہ سے اپنے شوہر کی ذات سے کراہیت معلوم ہوتی تھی وہی پوری مضبوطی کے ساتھ خود تیرے اندر موجود ہے۔ میں چونک اُٹھی

آواز جو کچھ کہہ رہی تھی وہ حرف بہ حرف صحیح تھا۔ میں ایک اچھی خاصی رقم کو اپنے وقتی آئڈیل کے جوش میں ہاتھ سے کھونے پر طیار نہ تھی۔ مجھے ان سے محبت ہو گئی تھی — بالکل پہلی بار مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جب ایک چیز انسان کی اپنی ملکیت ہو جاتی ہے تو اس کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ کتنا بدل جاتا ہے۔ ہم جو امیروں سے نفرت کرتے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ کوئی واقعی نفرت کے قابل ہوتے ہیں، بلکہ محض اس لئے کہ ہم خود ایسے کیوں نہیں — جب تک میں اپنے شوہر کے حال میں نہ تھی وہ مجھے انتہائی خسیس۔ چھچھورا اور زر پرست معلوم ہوتا تھا جب خود اسکی جگہ آگئی تو وہی تمام خصائص میری اپنی فطرت کے ہر گوشے سے پھوٹنے لگے تھے — میں حیران تھی۔ میرا سر زور زور سے چکر کھا رہا تھا۔ دل اور دماغ "ہاں" اور "نہیں" کے عجیب تذبذب میں مبتلا تھا — بالآخر میری قوت ارادی جاگ اُٹھی اور ایک فیصلہ کُن انداز میں روپوں کو ہاتھ میں لئے باہر ایک رکشا پر آ بیٹھی — قحط فنڈ کے دفتر پہونچتے پہونچتے تک راستہ میں اس خیال کے کئی شدید جھونکے آئے کہ اب بھی لوٹ پڑوں اور اس رقم کو اپنے کسی بُرے وقت کے لئے رکھ چھوڑوں — اسی اُدھیڑ بن میں دفتر تک آ پہونچی — دیکھا تو وہاں دفتر کے باہر ایک چھوٹی سی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ ایک شخص کو بیچ میں گھیرے کھڑے ہیں۔ ہر زبان تعریف کے پھول برسا رہی ہے۔ میں نے پاس ہی کھڑی ہوئی ایک عورت سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک سیٹھ کی جیب سے دو ہزار کی گڈیاں گر گئی تھیں۔ یہ شخص پہلے تو ان گڈیوں کو لیکر سیٹھ کی طرف بڑھا پھر کچھ خیال کر کے ان گڈیوں کو لئے سیدھا یہاں سکریٹری صاحب کے پاس چلا آیا کہ آخر یہ روپے بھی تو سیٹھ نے جانے کتنے بیکسوں اور غریبوں کی جان لیکر ہی حاصل کئے ہوں گے۔ ان کا جائز مصرف یہی ہے کہ انسے اناج خرید کر مفلسوں پر تقسیم کر دیا جائے" — آشا یہ کہہ رہی تھی کہ میری نگاہ سلیمان پر جا پڑی۔ دیکھا تو اس کا سر شرم سے جھکا جا رہا تھا۔ "وہ شخص" آشا نے غرور سے سر اُٹھاتے ہوئے کہا "آپ جانتے ہیں کون تھا۔ یہی آپ کے دوست جو اس طرح گردن جھکائے ہوئے ہیں" — میں اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔ "اس پر کہ دو دن سے فاقہ تھا اور مُنہ سے اچھی طرح بولی بھی نہیں نکل رہی تھی۔ ایک مسلمان کی عزت پہلی دفعہ میرے دل میں پیدا ہوئی۔ میں نے ان کا پتہ پوچھا۔ لیکن یہ کچھ اس طرح سٹ پٹائے سٹ پٹائے سے تھے کہ میں نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔ دل ہی دل میں ان کے چرنوں کی خاک آنکھوں پر ملی اور سکریٹری صاحب کے کمرہ میں چلی گئی۔ وہاں سے رقم دے کر لوٹی تو کسی کے اظہار ہمدردی پر کہ "فاقہ سے کیوں مر رہے ہو، چلو میں تم کو بھرتی کرائے دیتا ہوں، وہاں کافی پیسے اور مُفت کے کپڑے مل جائیں گے" ان کو یہ کہتے ہوئے سُنا "مجھے زندگی کچھ ایسی پیاری نہیں۔ جہاں اتنوں کی جان گئی میری بھی جائے گی لیکن ایک ایسی حکومت جس میں اتنے لوگ بھوکوں مر رہے ہوں اُس کا ساتھ دینا میرے ایمان کے خلاف ہے" — پہلا واقعہ سُن کر تو میرے دل میں ان کی عزت پیدا ہوئی تھی لیکن یہ سُن کر ------ آشا، محبت، کہنے والی تھی کہ سلیمان سے نگاہیں ملتے ہی شرما گئی۔

(۷)

اپنے شوہر کی روح سے انتقام لینے کے بعد یعنی اس کی کمائی کے روپیہ قحط کے امدادی فنڈ میں دے آنے سے میں دل کو بہت ہلکا پا رہی تھی۔ میرے دماغ کی بالائی سطح مختلف قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ کسی ایک خیال پر دماغ نہیں جم رہا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ روح کی گہرائیوں میں کہیں دور ایک چبھن سی ہو رہی ہے ۔۔۔ میری ناگہانی بیوگی میرے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی ۔۔ میں سوچنے لگی ۔۔۔ اب کیا کروں — شادی کو تو میں ایک سماجی معاہدہ سمجھتی ہوں جب تک میاں بیوی زندہ ہیں عورت مرد کا رشتۂ تعلق باقی ہے ۔۔۔۔ وہ اندرونی چبھن احساس کی نامعلوم سطح سے آہستہ آہستہ اوپر اُبھرنا شروع ہوئی ۔۔۔۔ لیکن میں ایک بیوہ ہوں ۔۔۔۔ دوسری شادی کا تصور بھی میرے لئے جُرم ہے ۔۔۔۔ پھر بیوہ سے شادی کون کرے گا ۔۔۔۔ وہ چبھن بڑھنے لگی اور اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ امدادی فنڈ کے دفتر کی تصویر آکر سامنے کھڑی ہو گئی — اب مجھے یہ چبھن بالکل نزدیک آکر پوری شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی — کیا فطرت میرے گھمنڈ کا سر وہیں جھکانا چاہتی تھی۔ اگر میں اپنے آپ کو عام سطح سے ذرا اونچا سمجھ کر قحط فنڈ میں پانچ ہزار روپیہ کا ہدیہ پیش کرنے گئی تھی تو کیا یہ بھی ضرور تھا کہ سیٹھ کی جیب سے گرا ہوا روپیہ لے کر وہ شخص بھی ٹھیک اس وقت وہاں پہونچتا — آنا ہی تھا تو کچھ پہلے آکر چلا جاتا یا میرے واپس آجانے کے بعد وہاں جاتا۔ سارا مجمع اسی کی ستائش میں رطب اللسان تھا۔ میں نے جس فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا اس پر کسی کی نظر نہیں گئی — سکریٹری صاحب اگر شکرہ اور حوصلہ افزائی کے دو چار رسمی حرف نہ بولے ہوتے تو شاید میرا یہ غیر معمولی اقدام کسی یتیم بچے کی طرح ہی دفن ہو گیا ہوتا" — اب میں سمجھی کہ مجھے اصلی دُکھ اس بات کا ہے کہ میری تعریف بھی اس شخص کی طرح کیوں نہ کی گئی اور یہی صدمہ میری روح میں اینٹھن پیدا کر رہا تھا۔ یہ بیوگی اور شادی کے مسائل تو ضمنی باتوں کی طرح دماغ کے اردگرد چکر لگا رہے تھے — میں ہنس پڑی ۔ دوسروں کی زبان سے اپنی ذاتی خوبیوں کا اعتراف عورت کی فطرت کا بڑا کمزور پہلو ہے" — "کیوں عورت ہی کا کیوں" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔" مردوں کی فطرت کے ساتھ بھی یہ بات اسی طرح صحیح ہے اور اس شدت کے ساتھ کہ بعض ایسے لوگ جو کبھی کوئی قابل ستائش کام نہیں کرتے چند لوگوں کی جماعت صرف اس لئے اپنے ساتھ رکھتے ہیں کہ وہ ان کی جھوٹی تعریفیں کیا کریں۔ ہندوستان کے نوابوں نے جو مصاحبت کا ادارہ قائم کیا ہے وہ اس حقیقت کی کھلی ہوئی دلیل ہے" — "ممکن ہے" آشا گرتے ہوئے آنچل کو سنبھالتی ہوئی بولی — "اچھا پھر کیا ہوا" — "بس یہی کہ — لیکن میں آپ کی سمع خراشی تو نہیں کر رہی ہوں" — "بالکل نہیں۔ آپ کی آپ بیتی کا ایک ایک حرف سبق آموز ہے۔ اُس پر آپ کا دلکش انداز بیان۔ ارے بھائی اکبر کدھر چلدئے" — "وہ شاید نماز پڑھنے گئے ہوں گے۔ مغرب کا وقت ہو گیا ہے کیا آپ بھی" — "جی نہیں، میں اب کیمپ لوٹ ہی کر یہ سب کچھ کروں گا۔ سردست تو آپ کی کہانی میں دل لگا ہوا ہے" — غرض یہ کہ میں بہت جلد اس نتیجہ پر پہونچ گئی کہ مجھے

کل ہی راج شاہی روانہ ہوجانا چاہئے۔ بادل برس کر کھل گیا تھا اور فضا پر ایک خاص دل ربائی چھائی ہوئی تھی۔ میں شاہراہ کی گہما گہمی سے جی بہلانے کے لئے سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ شام جلد جلد رات میں تبدیل ہوتی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر میں فضا بالکل تاریک ہوگئی۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے وہاں کھڑے رہنے میں کوئی لطف نہ تھا۔ اندر گئی اور ٹیگور کی مشہور ناول گورا لے کر بستر پر لیٹ گئی۔ پھر کچھ خیال آتے ہی کتاب رکھدی اور سوچ میں ڈوب گئی ـــــ ہے ایشور اب کیا ہوگا۔ یہ سوچکر تو ایک گونہ اطمینان محسوس کر رہی تھی کہ میں اب قید ازدواج کی جگر سوز بندھنوں سے آزاد ہوں، اور وہ روح فرسا مصیبت جو ایسے کٹھور شوہر کی شکل میں مجھ پر نازل تھی ٹل چکی ہے لیکن پھر بھی نہ معلوم کیوں دل بھرا آرہا تھا۔ بالکل پہلی دفعہ میرے شوہر بلکہ جی کی یاد آنسو بن کر آنکھوں میں ڈبڈبا آئی۔ ایک قطرہ آنکھ کے اس گوشہ سے اور ایک قطرہ آنکھ کے اس گوشہ سے ڈھلک کر بستر پر گرا۔ سوچی ابھی پونے آٹھ ہوئے ہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد کملا دیوی کا نوکر سونے کے لئے آجائیگا۔ سیڑھی کا دروازہ وہی بند کر لیگا۔ چلوں بعض ضروری چیزیں اسوقت سمیٹ کر باندھ لوں۔ یہ سوچ کر اٹھنے ہی والی تھی کہ دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور یہ ۔۔۔۔ "کون سلیمان" میں نے اچنبھا ہوکر پوچھا ـــ "جی ہاں" یہی سر سے پاؤں تک خون میں تربتر تھرائے ہوئے سامنے کھڑے تھے ـــ "آپ اسوقت اس عالم میں یہاں کہاں" ـــ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا ـــ "چند گورے ایک نوجوان بھکارن کو زبردستی کھینچے لئے جارہے تھے" ـــ انھوں نے ہانپتی ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا "لڑکی چیخ رہی تھی مگر آنے جانے والوں میں کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ٹامیوں کی گرفت سے لڑکی کو نجات دلاتا۔ جب وہ ایک تاریک گلی میں پہونچے تو میں نے جاکر لڑکی کے ہاتھ پکڑ لئے۔ گورے نشہ میں چور مجھ سے لپٹ پڑے۔ میں نے اپنا چھرا بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک اور پھر دوسرے کے پہلو میں دستہ تک بھونک دیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگئے ـــ لڑکی غائب ہوچکی تھی ـــ بقیہ دو نے میرا تعاقب کیا۔ انکے ساتھ سڑک کے راہی بھی میرے پیچھے دوڑے۔ میں گلی در گلی ہوتا ہوا راستہ نہ پاکر اس کوٹھے پر چڑھ گیا ـــ میری جان آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں قاتل ضرور ہوں مگر دو اوباش گوروں کا جو سر راہ دن دھاڑے ہماری ماں بہنوں کی عزت لوٹ رہے ہیں" ـــ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چکر سا آرہا ہے۔ پھر کچھ لوگ بڑے بڑے بوٹ پہنے دھم دھم میری سیڑھی پر چڑھتے ہوئے معلوم ہوئے ـــ "آپ اتنی خوف زدہ نہ ہوں۔ میں نے سیڑھی کا دروازہ بند کر دیا ہے" ـــ وہ ابھی یہ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ میں بیہوش ہوکر زمین پر گر چکی تھی ـــ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان کا بچانا اپنا فرض سمجھا۔ جس کے دل میں قوم کی اتنی عزت اور ملک کا اتنا درد ہو اس کو مصیبتوں میں تنہا چھوڑنا مجھے اپنے دھرم کے خلاف معلوم ہوا ـــ یہ بیان کرتے وقت آشا کے چہرے کی رنگت اور اس کی آنکھوں کی وہ شرمائی کیفیت جسے سنبھالنے کی وہ کامیاب کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دل کا یہ راز بری طرح کھول رہی تھی کہ ملک و قوم کے جذبہ کے علاوہ کوئی اور جذبہ بھی اس کار خیر میں شریک تھا ـــــ بہت تڑکے ہم لوگ کلکتہ چھوڑ چکے تھے۔

"اب میں سمجھا کہ سلیمان کے داڑھی چھوڑنے اور نام بدلنے کا اصلی راز یہ تھا ـــ آشا کا مالتی سے آشا ہو جانے کی وجہ بھی یہی تھی" ـــ رائے بریلی، الہ آباد وہاں سے بنارس۔ بنارس سے پھر کانپور۔ غرض کچھ دنوں یہاں وہاں کی ٹھوکریں کھاتی رہی ـــ یہ میرے مفروضہ سوامی تھے اور میں ان کی داسی۔ ان تمام صحرانوردیوں کے دوران میں بڑی گہرائی سے میں ان کی فطرت کا جایزہ لے رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت تھی کہ ایک معمولی سطح کا مسلمان اتنا روادار اور روشن خیال کیونکر ہو سکتا ہے۔ آخر رائے یہ ہوئی کہ ہم لوگ لکھنؤ چلیں۔ لکھنؤ سے یہ پہلے سے بھی واقف تھے۔ میں البتہ ان کے ہاتھ میں اندھے کی طرح ہاتھ دئے ہوئے تھی۔ اس مکان میں آئے تین ماہ گزر چکے تو... ... ٹھہریئے میں ابھی آئی" ـــ آشا کا سوتا ہوا بچہ جاگ پڑا تھا ـــ آشا کی داستان حیات کچھ اتنی غیر معمولی اور تحیر انگیز تھی کہ میں ارد گرد کے حالات سے قطعاً بے خبر بالکل اس کی کہانی میں غرق تھا ـــ "ہاں تو میں کیا کر رہی تھی" ـــ آشا نے بچہ کو گود میں لئے ہوئے پوچھا ـــ "یہی کہ" اس مکان میں آئے ... ... " جی ہاں، اللہ آپ کا بھلا کرے ـــ جب اس مکان میں آئے تین ماہ گزر چکے تو ہم لوگوں نے سوچا روزی کا کوئی سہارا نکالنا چاہئے۔ یہ میرے پیسے لینا چاہتے نہیں تھے۔ ان کے خیال میں عورت کا دل چھوٹا ہوتا ہے ـــ خیر بہ مشکل راضی ہوئے اور تمباکو کی ایک دوکان امین آباد میں کھول لی گئی۔

ایک دن پریشان، خستہ حال آکر میرے نزدیک بیٹھ گئے، داڑھی کے بال آنسوؤں سے تر ـــ "اے۔ یہ کیا" میں نے گھبرا کر پوچھا، ان کی آواز ان کے گلے میں اٹک رہی تھی ـــ آنسو سنبھالتے ہوئے بولے ـــ "دیوی جی، آپ جانتی ہیں میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ نہ مجھے کسی کی خبر لینی ہے نہ کوئی میری خبر لینے والا ہے۔ اس زندگی میں زمانہ کے بہت سرد و گرم دیکھے۔ میری مسیں بھیگ رہی تھیں جب مجھے اپنے محلہ کی ایک عورت سے کچھ محبت سی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا اس کی محبت کے ٹھنڈے سایہ میں زندگی کے دن کٹ جائیں گے۔ میں اس وقت محبت کو اور لوگوں کی طرح دنیا کی سب سے زیادہ پوتر اور پاکیزہ چیز سمجھتا تھا۔ گنگا کی موجوں سے زیادہ پاکیزہ ـــ محفل حیات محبت کے حسین قمقموں سے جگمگاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ـــ میرا ایمان تھا اس فانی دنیا میں اگر کوئی چیز غیر فانی ہے تو محبت ـــ لیکن میں ایک سناٹے میں آگیا جب حلیمہ مجھے ہر طرح اپنا بنا لینے کے بعد اپنے رشتہ کے ایک بھائی سے جو کسی دفتر میں بیس روپیہ ماہانہ پر ملازم تھا شادی کرنے پر طیار ہو گئی ـــ مجھے حلیمہ سے کچھ ایسا گہرا لگاؤ ہو گیا تھا کہ میں نے شادی کے بعد بھی اس سے دوستانہ راہ و رسم باقی رکھنا چاہا ـــ لیکن نہ جانے وہ کیوں مجھ سے کترانے لگی ـــ حالانکہ اس کا شوہر اس معاملہ میں سخت نہ تھا اور یوں بھی شادی کے بعد دو پرانے دوستوں کا آپس میں ملنا ملانا کوئی گناہ نہیں۔ جب سے محبت کے نام سے مجھے گویا نفرت سی ہو گئی ہے۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب کسی عورت کو اپنی زندگی میں شریک نہ ہونے دونگا۔ "تو اس عہد پر قایم رہنا آپ کا اخلاقی فرض ہے"۔ میں نے اپنی کمزور آواز کو مضبوط بنائے ہوئے کہا ـــ ارادہ تو میرا

بھی یہی تھا لیکن اب ۔۔۔۔" ان کا چہرہ یکایک زرد پڑ گیا۔ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ "بس یہی کہ زندگی کی سہ پہر ہو رہی ہے۔ چھتیس سے زیادہ سن ہو چکا۔ اگرچہ قوا میرے بظاہر مضبوط معلوم ہوتے ہیں لیکن اندر سے میں اپنے کو بالکل کھوکھلا محسوس کرتا ہوں۔ دل چاہتا تھا کوئی ایسا جیون ساتھی مل جاتا جس کی سچی ہمدردی میری گرتی ہوئی صحت کو سنبھال لیتی ۔" میں خاموش تھی مگر میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔۔۔ اگر آپ مجھے نیچا نہ سمجھیں تو ایک بات کہوں ۔۔۔۔ آخر یہ ۔۔۔۔۔ یہ پتی ۔۔۔ پتنی کا جھوٹا کھیل ہم لوگ کب تک کھیلتے رہیں گے ۔۔۔۔" ان کی زبان سے یہ جملہ بہ مشکل ٹھوکر کھاتا ہوا نکلا ۔۔ "اگر آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کا سچا دوست بن کر زندگی میں آپ کا ساتھ دے سکوں گا تو آیئے آج اس مصنوعی کھیل کو حقیقت میں بدل دیا جائے ۔ میں اس قابل تو نہیں کہ آپ کا شوہر بن سکوں۔ لیکن عورت وہ جادو ہے جو چاہے تو پتھر کو پارس بنا دے۔ میری نجات آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔ میں اپنے طوفان مارتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل آنکھوں میں سنبھالے ہوئے تھی۔ میرے جھکی ہوئی گردن اور جھکی جا رہی تھی۔ حلق میں ضبط گریہ کی وجہ سے ایک کپکپاہٹ سی ہو رہی تھی۔ مجھ سے کچھ بولا نہ جا رہا تھا۔ آج اتنے دنوں کی تپسیا محبت کی بھری تھالی لئے سامنے کھڑی تھی۔ دیوتا خود بھکاری کے دروازہ پر کھڑے بھکشا کی صدا لگا رہے تھے ۔ مجھے بالکل خاموش دیکھ کر بولے ۔" شاید یہ مذہب کا فرق آپ کو پریشان کر رہا ہے" مالتی دیوی یہ سچ ہے کہ میں ایک کم حیثیت اور کم علم آدمی ہوں ۔۔۔۔ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں ۔۔۔۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں صرف ایک چائے والا ہوں۔ لیکن کسی مدرسہ میں سر کھپانے یا کسی اُستاد کے آگے زانوئے ادب تہ کئے بغیر بھی ایک آدمی انسان بن سکتا ہے۔ صرف ایک سوزش کی ایک تڑپ کی ضرورت ہے اور وہ تڑپ وہ سوزش میرے اندر موجود تھی۔ جب وہ اُبھری تو میں دوسرا ہی آدمی تھا۔ میری فطرت کا انقلاب کتابوں سے زیادہ اچھی صحبت اور ان حوادث کا رہین منت ہے جو میری زندگی سے کھیلتے رہے۔ میری چائے کی دوکان صرف چائے کی دوکان نہ تھی۔ وہ کلکتہ کے بہت سے پریشان حال پروفیسروں، اخبار نویسوں اور شاعروں کی "شام کا کلب" بھی تھی۔ جہاں شام صبح ہر قسم کے قومی اور بین الاقوامی مسایل پر گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ مذہبی تنگ نظری یوں بھی میرے اندر کوئی قوی نہ تھی۔ ایسے آزاد خیال لوگوں کی ہمنشینی اور کتابوں کے مطالعہ سے رہا سہا تعصب بھی جاتا رہا۔ آج میرا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا مذہب اپنی اولاد ہی کی طرح اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں سے محمدؐ۔ عیسائیوں سے عیسیٰ۔ زردشتیوں سے زردشت اور ہندوؤں سے بدھ اور کرشن کی محبت و عزت کون چھین سکتا ہے۔ یہ اصرار کہ صرف محمدؐ یا صرف عیسیٰؑ یا صرف کرشن صحیح راستہ پر تھے بقیہ گمراہ ایک اندھے قسم کی ہٹ دھرمی ہے۔ میں یہ زور زبردستی کرنے والا کون کہ آپ اپنی دیوی دیوتاؤں کی پوجا چھوڑ کر میرے خدا کی پرستش شروع کر دیجئے۔ دیر و حرم کی تفریق ایک خیالی تفریق ہے۔ یہ تو ایک ایسا رشتہ ہے جو ایک ایسا رشتہ ہے جو انسان اپنے اور خدا کے درمیان

قایم کرتا ہے - اس کا اثر ہماری سماجی رشتہ داری پر کیوں پڑے - آپ مطمئن رہیں میں آپ کے مذہبی عقاید و رسوم میں بالکل کوئی دخل نہیں دوں گا - آپ اپنی پوجا پاٹ میں اسی طرح آزاد رہیں گی جس طرح میں اپنے روزہ نماز میں - میری آنکھوں سے آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے - بس یہی دل چاہتا تھا کہ ان کے چرنوں پر سر رکھ دوں اور کہوں سوامی تمھیں جاہل کون کہہ سکتا ہے - جو روشنی تمھاری روح کو جگمگا رہی ہے وہ بڑے بڑے دھرماتماؤں میں نہیں پائی جاتی - اگر تعلیم اس تعصب - سخت دلی اور بدنفسی کا نام ہے جو میرے بی، اے پاس شوہر کی تھی یا جو اس کے جیسے ہزاروں تعلیم یافتوں میں پائی جاتی ہے تو میں ایسے ہزار تعلیم یافتہ جاہلوں کو تمھارے اوپر قربان کرنے کو طیار ہوں — دل کو قابو میں کر کے آنسو بھرے ہوئے لہجہ میں بولی - لیکن شاید آپ یہ بھول رہے ہیں کہ میں ایک بیوہ بھی ہوں — "تو کیا ہوا" — یہ بے ساختہ بول اُٹھے " میرے لئے یہ کوئی رکاوٹ نہیں - میری یہ خود دوسری شادی ہوگی - حلیمہ کو میں ہمیشہ اپنی بیوی سمجھتا رہا گو وہ دوسرے کی ہو چکی تھی - بعض شادیاں کھلے بندوں ڈھول اور باجوں کے ہنگاموں میں رچائی جاتی ہیں بعض دلوں کی خاموش انگنائی میں - بعض کا تعلق جسم سے ہوتا ہے بعض کا روح سے - اگر حلیمہ آج دنیا میں موجود ہوتی تو شاید اس کے ہوتے ہوئے میں کسی حور کا تصور بھی اپنے لئے حرام سمجھتا میری اس روحانی شادی کے برخلاف آپ کی سماجی شادی بقول آپ ہی کے بالکل ناجائز تھی - آپ کا دل کبھی آپ کے شوہر سے کھل کر نہیں ملا - آپ چونکہ تعلیم یافتہ اور اپنے خیالات کے اظہار میں آزاد ہیں اس لئے آپ نے دل کی سچی بات بے خوف ہو کر صفائی سے کہہ ڈالی - لیکن یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ آج ہندوستان میں ہزاروں میاں بیوی قطعاً ناجائز قسم کی ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں - اگر آج ان بدنصیب اور مقید عورتوں پر سے سماج کا خوف اور رواج کی بھاری زنجیریں اُٹھالی جائیں تو عورتوں کی ایک بھیڑ ہوگی جو اپنے جابر غضبناک اور قابل نفرت شوہروں کے گھر سے بھاگی جا رہی ہوگی - آپ کا یہ نظریۂ ازدواج حرف بہ حرف صحیح ہے کہ شادی بالکل ایک سماجی معاہدہ ہے - یہ ایک ایسا ٹھیکہ ہے جو عورت اور مرد کے درمیان صرف زندگی بھر تک کے لئے کیا جاتا ہے - دونوں میں سے کسی ایک کا رشتۂ حیات ٹوٹتے ہی معاہدہ کی میعاد بھی ختم ہو جاتی ہے - آج سماج کا یہ قانون کہ صرف مرد ہی اس عہد کو اپنی بیوی کی موت کے بعد توڑ سکتا ہے چاہے اس کی عمر اس وقت پچاس پچپن ہی کیوں نہ ہو سراسر ظلم اور ناانصافی ہے - عورتوں کی ذہنی ترقی ہو لینے دیجئے یہ رسم ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہے گی — آج سے صرف نصف صدی کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے وہ اس وقت ممکن ہے ناجائز، ذلیل اور گھناؤنا معلوم ہو مگر اُس وقت یہی باتیں بالکل جائز شریفانہ اور دلپذیر ہو جائیں گی - ہم اور آپ اگر اپنے وقت سے سو پچاس برس قبل اس خاک آباد میں آگئے ہیں تو قصور ہم لوگوں کا نہیں فطرت کا ہے -

(۹)

غرض ڈیڑھ سال سے کچھ زیادہ ہوا کہ ہم دونوں اس چھوٹے سے مکان میں راجہ رانی جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت عورت ہوں۔ اب بھی کبھی کبھی خواب میں میرا پہلا شوہر نظر آجاتا ہے تو میں چیخ کر جاگ اُٹھتی ہوں کہ کہیں پھر اس زندگی کا عذاب تو مجھ پر نازل نہیں ہوگیا۔ آیئے آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔ آشا مجھ کو ایک چھوٹی سی کوٹھری کے پاس لے گئی۔ اندر سے عود، لوبان اور خوشبودار مسالوں کے جلنے کی بو آرہی تھی۔ آشا نے مجھ سے مسکرا کر کہا۔ کعبہ اور کاشی کو ایک ساتھ دیکھنا ہو تو اس کوٹھری میں دیکھئے۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک آسنی پر کچھ پھول رکھے ہوئے تھے اور سامنے بھگوت گیتا کھلی ہوئی تھی۔ اس سے ذرا ہٹ کر بغل میں نماز کی ایک نہایت خوبصورت چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر خانہ کعبہ کا نقشہ بنا ہوا تھا اور اس پر رحل میں نہایت دیدہ زیب جزدان میں قرآن شریف رکھا تھا۔ آشا نے مجھ سے کہا "افسر صاحب یہ کوٹھری ہم لوگوں کی مشترک عبادت گاہ ہے۔ زندگی کو ہم لوگوں نے ایک نیا رنگ دے رکھا ہے اور ہندوستان کے لئے ایک نیا مستقبل تعمیر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔"

میں باہر نکلا تو عالم ہی اور تھا۔ اپنی ذات سے نفرت معلوم ہو رہی تھی، سلیمان چائے کی دوکان سے اُٹھکر روحانیت کی اونچی چوٹی پر پہونچ گیا تھا، یعنی وہ اپنی زندگی میں اُس حقیقت کو پاگیا جس کی تلاش میں انسانیت کب سے ٹھوکریں کھا رہی ہے اور نہ جانے کب تک ٹھوکریں کھاتی رہے گی اور ایک میں ہوں کہ آج تک کفر و ایمان کے تنگ دائرہ سے آزاد نہ ہو سکا۔ رات اگرچہ کافی آچکی تھی لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ دل کی فضا روحانی کیفیتوں سے معمور تھی — سوچا کہ اور کچھ نہیں تو اس واقعہ کو تو قلم بند کرلوں۔ فوجی زندگی کا کیا ٹھکانا۔ اگر ایک دل پر بھی میری اس تحریر کا کچھ اثر ہوگیا تو میں سمجھوں گا کہ زندگی کا بہت بڑا فرض انجام پاگیا۔ قلم اُٹھایا تو افسانہ طیار تھا۔

عاشق ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

نظیر جعفری

ضرورت رشتہ

ایک معزز خاندان کے صحیح و توانا نوجوان (ام، اے، ال، ال، بی) کے لئے جو محکمہ اکسائز میں انسپکٹر کے عہدہ پر مامور ہے، رشتہ کی ضرورت ہے۔ لڑکی قبول صورت، سلیقہ مند، خوش مزاج اور شریف خاندان کی ہونا چاہیے۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اس پتہ پر کی جائے :- ع ۔ ر = ذریعہ منیجر نگار۔ لکھنؤ

اقبالؔ اور اسلام کے اولین اُصول

اقبالؔ ایک جامع حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا پیغام ایک ہمہ گیر پیغام ہے۔ جس میں وہ سب کچھ ہے جو ہونا چاہئے اور جس کی ضرورت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اقبالؔ کا پیغام شعر کی لے اور نغمہ کی زبان میں ادا ہوا ہے۔ اس پیغام کی روح حکمت کی جان ہے جسے پیغامبر کے سوزِ نہاں نے ساز کی سی دُھنیں عطا کر دی ہیں۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت ست شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

لیکن یہ کیسی بیدردی کی بات ہے کہ شاعر کے سوزِ دل کو ساز زبان کی رنگینیوں میں اور اس کے پیغام کی جان کو طرزِ بیان کی رعنائیوں میں کچھ اس طرح گھلا ملا دیا گیا ہے کہ اس کے اصلی خط و خال اُبھرنے نہیں پائے۔ ضرورت ہے کہ اقبالؔ کے پیغام کو زبان و بیان کے رنگین پردوں سے عریاں کیا جائے۔ ہر چند یہ ایک نہایت ہی غیر شاعرانہ کام ہے مگر جیسے بنے اسے انجام دینا چاہئے۔ ادب اور شعر کی خاطر نہیں تو حق اور حکمت ہی کے لئے سہی۔

اس لئے بھی اس کی ضرورت ہے کہ اقبالؔ نے اپنے پیغام کو صرف شعر و نغمہ ہی کے لباس رنگیں میں جلوہ نہیں دیا بلکہ اس کے لئے انھوں نے سوز سے خالی اور سادہ و بے رنگ حکمت کا پیرایۂ بیان بھی اختیار کیا ہے۔ اقبالؔ کی الگ الگ دو حیثیتیں ہیں۔ ایک نے نواز اور نغمہ ساز کی۔ اس حیثیت میں انھوں نے حقایق کی پردہ داری کرتے ہوئے ان کو مجاز کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ دوسری حکیم پردہ در کی۔ اس حیثیت میں حجابات درمیان سے اُٹھا کر انھوں نے راز کو عیاں کر دیا ہے۔

دراصل اقبالؔ کی شاعری گل و بلبل والی شاعری نہیں۔ اسکی شاعری کی روح وہ پنہاں حقایق ہیں جو شاعر کے آئینۂ قلب میں پرتو افگن ہوئے ہیں اور شاعر نے ان میں جذبات کی رنگ آمیزی بھی کر دی ہے۔ اس رنگ آمیزی نے ان بظاہر بے جان حقایق کو روح اور حرکت سے مالا مال کیا ہے۔ جس سے غالبؔ کے یہ "حجاب" "پردۂ ساز" کی طرح خود بخود ترنم ریز ہو گئے ہیں۔ اقبالؔ کی نغمہ سنجی نے دراصل ہر فردِ ملت کو "دانائے نوا ہائے راز" ہی نہیں بلکہ ان کا دمساز بھی بنا دیا ہے

دلا رمزِ حیات از غنچہ آموز حقیقت در مجازش بے حجاب ست
زخاک تیرہ می روید ولیکن، نگاہش بر شعاع آفتاب ست

فکر اقبال کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حیات اور کائنات کو مابعد الطبیعیاتی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ نگاہ ہی دراصل ان جلووں کی حریف ہوسکتی ہے جو ان کے مظاہر کے پیچھے بے حجاب ہیں۔ کائنات کا مطالعہ صرف ایک طرح ہوسکتا ہے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی بھی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ فکر و وجدان کے سامنے مظاہر و مناظر کی تجرید کی جائے۔ قدرت نے جن حقایق کو مجاز کے لباس مستعار میں پیش کیا ہے ان سے یہ تمام مجازی پردے نوچ کر پھینکدئے جائیں۔ ان پر رنگوں کی جو تہیں چڑھی ہوئی ہیں ان کو کھرچ کر صاف کر دیا جائے۔ اس وقت ہم ان حقایق کا عریاں مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ مابعد الطبیعاتی نقطۂ نگاہ بھی ایک طرح کا تجریدی عمل ہی ہے جس سے مدبر اقبال نے کائنات کی نقاب کشائی کی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ اس وسیع کائنات کی حقیقت واحد ہے۔ اور اس کا عمل بھی ایک ہی ہے۔ اس حقیقت واحدہ کے بے شمار نام ہیں جو اس کی گوناگوں صفات اور رنگارنگ امکانات کو سامنے رکھ کر حقیقتِ کبریٰ یا حیات حقیقی (Ultimate Reality) کہہ سکتے ہیں۔ اس حقیقتِ کبریٰ کا عمل دوران و حرکت ہے جس سے یہ کائنات بن سنور رہی ہے اور یونہی بنتی سنورتی چلی جائے گی۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک ست

مختصر الفاظ میں کائنات کی داستان ارتقاء یہی ہے جسے میں نے ذرا وضاحت کے ساتھ اپنے ایک مضمون میں۔ جس کا عنوان ہے "فکر اقبال کا مرکزی خیال"۔ بیان بھی کر دیا ہے۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے اس کی یہ فکری خصوصیت بہرحال پیش نظر رہنا چاہئے۔ اور پھر اس کی روشنی میں ان کے اُن تمام افکار پر نظر کی جائے جو حیات اور اس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ حیات کوئی بے راہ حقیقت نہیں۔ وہ بھی کائنات اور اس کے اُصول سے وابستہ ہے۔ چشمۂ وجود کی وہ بھی ایک مستانہ لہر ہے جو بل کھاتی اور مچلتی دور نکل گئی ہے۔ مسائل حیات کا تنوع اس کا مقتضی ہے کہ اس کے ہر پہلو پر جدا جدا نظر ڈالی جائے اور شرح و وضاحت کے لئے بھی یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ مگر اس میں جو پھیلاؤ ہے، اس سے یہ خطرہ ہے کہ مبادا فکر کا اصل سررشتہ تفصیل کے سیر پھیر میں گم ہوجائے، اس لئے میں نے اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اولاً فلسفۂ اقبال کی مابعد الطبیعاتی وحدتیں روشن کر دی جائیں اور اس کے بعد ان مابعد الطبیعاتی وحدتوں کو وسعت دے کر تقابل اور تماثل کو کام میں لاکر حیات کی رنگینیوں کو بھی اسی نوع کی وحدتوں میں سمو دیا جائے۔ مسائل حیات میں جو بظاہر اختلاف نظر آرہا ہے اس کے رفع کرنے کی بہتر صورت یہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان پیچیدہ مسایل کو بھی آسانی کے ساتھ سلجھایا جاسکتا ہے۔

عالم کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو بقا و دوام کا ہے، دوسرا فنا و دوران کا۔ حیات کے بھی دو رخ ہیں، سکونی، دوامی اور دوسرا حرکی یا دورانی۔ اقبال نے اولیں رُخ کے لئے "توحید" کا جامع لفظ تجویز کیا ہے، اور حیات کے حرکی پہلو کی تعبیر اس نے "اجتہاد" سے کی ہے۔ حرکت محض در اصل ممکن نہیں یعنی ایسی حرکت جس کا کوئی مرکز نہ ہو۔ اور

اگر ممکن ہے تو وہ حرکت نہیں بلکہ ایک طرح کا بے اصولا پن ہے، ایک نوع کی بیراہی ہے۔ ایک قسم کا انتشار اور آشفتگی ہے۔ برکت ایسی حرکت میں ہے جو مرکز یا مقصد متعین کرنے کے بعد کی جائے۔ یا جو کسی مقصد کے چاروں طرف طواف کی صورت میں ہو ——— اجرام فلکی یا سیارات کی حرکت بھی اس نوع کی ہے وہ نظام شمسی کے ماتحت قانون تجاذب کی پابند ہے۔ کائنات کی تمام حرکتیں، خواہ وہ کسی قسم کی کیوں نہ ہوں، ایک قانون اور ایک مرکز کے تابع ہیں اور اسی حد تک راہِ ارتقاء پر رواں ہیں جس حد تک مرکز اور قانون نے ان کو اس کی اجازت دی ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں لکھا ہے :۔

"اسلام کے نزدیک زندگی کی روحانی اساس دائمی اور سرمدی ہے جو اپنے کو گوناگوں اور بوقلموں تغیر میں آشکارا کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک معاشرہ کو جو حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی ہے زندگی میں، ثبات و تغیر کے معقولات کو ہم آہنگ بنانا چاہئے"

ان معقولات کو ہم آہنگ بنانے کی صورت یہ ہے :

"اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لئے اس کے پاس کچھ ابدی اُصول ہونا چاہئیں۔ اس لئے کہ ابدی اُصول ہی کے ذریعہ ہم اس پیہم بدلنے والی دنیا میں قدم جما سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ سرمدی اُصول تغیر کے امکانات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہی تغیر جو قرآن کی رو سے خدا کی عظیم الشان نشانیوں میں سے ہے۔ تو اس سے جو چیز اپنی ذات میں تغیر پذیر ہے وہ غیر متحرک اور جامد ہو جاتی ہے" (خطبات انگریزی۔ صفحہ ۱۴۰)

عدل، مساوات، استحکام نفس اور آزادی۔ یہ ہیں وہ ابدی اُصول جو توحید سے ظہور میں آتے ہیں اور توحید کو ایک عملی تصور کے طور پر انسانی زندگی کا اہم محرک بناتے ہیں۔ یہ دراصل اعلیٰ مذہبی قدریں ہیں۔ انسان ہی نہیں بلکہ زمین و آسمان کا قیام بھی ان قدروں سے ہے۔ انبیاء علیہم السلام انھیں ابدی قدروں کی تبلیغ کے لئے مامور ہوئے تھے۔ لیکن ان کی تکمیل کے لئے ایک طویل مدت درکار تھی۔ آدم سے لیکر عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء بھی آئے اور جہاں جہاں آئے سب نے کسی نہ کسی صورت میں ان قدروں کو سامنے رکھا اور دوسروں سے ان کو منوایا۔ لیکن اب تک یہ مظاہر کے تہ بر تہ پردوں میں پنہاں تھیں۔ سب سے آخری نبی نے ان کو بے پردہ کیا اور مکمل فرمایا۔ قرآن شریف میں شاید اسی تکمیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی" — ہم نے آج تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل فرمایا اور اپنی نعمتوں سے تم کو سرفراز کیا۔

حیات میں گوناگونی اور کثرت پائی جاتی ہے۔ اس سے ذات اور غیر ذات یا اقبال کے الفاظ میں خودی اور بیخودی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ان قدروں میں سے دو ایسی ہیں جن کا تعلق ذات، نفس، یا خودی سے ہے یعنی استحکام اور

آزادی - استحکام ——— نام ہے ذات کی تربیت، نفس کی تہذیب، اور خودی کے احساس کا۔ نفس کی ترقی یہ ہے کہ اسکو کمال سے آشنا کیا جائے۔ اور کمال آشنا کرنے کے لئے اس کی تہذیب و تربیت ضروری ہے۔ اسلام نے انسان کے بالا و برتر کمال کے لئے فوز و فلاح دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو نجات، کامیابی، ارتقار اور اسکے ہم معنی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک نفس یا ذات کی کامیابی کی اولین شرط اسکی یہی تربیت ہے۔

قد افلح من ذکھا و قد خاب من دسّھا۔

کامیاب وہی ہے جس نے نفس کو ترقی دی۔ اور جس نے اسے پست بنایا وہ ناکام رہا۔

اقبال نے تربیت نفس کے اُصول بھی بیان کئے ہیں جن کی تفصیل و تشریح کا یہ موقع نہیں۔ تربیت نفس کا جامع ترین اُصول یہ ہے کہ انسان اپنے میں الٰہی صفات اور کمالات کی جھلک پیدا کرے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے۔ "تخلقوا باخلاق اللہ" (خدا کے اخلاق و صفات اختیار کرو) خدا کی صفات یوں تو بے شمار ہیں مگر ان میں سے ایک صفت تخلیق ایسی ہے جو انسان کو اس بے پایاں عالم میں اس کا صحیح اور سچا جانشین بناتی ہے ——— "ندائے جمال" کے عنوان سے اقبال نے لکھا تھا:-

زندگی ہم فانی و ہم باقی ست — ایں ہمہ خلاقی و مشتاقی ست
زندۂ خلاق شو، مشتاق شو، — ہم چو ما گیرندۂ آفاق شو
در شکن آنرا کہ ناید سازگار، — از خمیر خود دگر عالم بیار
بندۂ آزاد را آید گراں، — زیستن اندر جہان دیگراں
ہر کہ او را قوت تخلیق نیست، — پیش ما جز کافر و زندیق نیست
از جمال ما نصیب خود نبرد، — از نخیل زندگانی بر نخورد،

مرد حق برّندہ چو شمشیر باش
خود جہان خویش را تقدیر باش

آزادی بھی در اصل خدا ہی کی ایک صفت ہے اور اس حیثیت سے اسے جداگانہ قدر شمار نہ کرنا چاہیئے تھا۔ انسانیت کے عہد طفولیت میں چونکہ انسان آزادی سے محروم رکھا گیا تھا اور اسلام ہی نے سب سے پہلے اس کی راہیں اس کے سامنے کھولیں اس لئے اقبال نے اس کو اسلام کی ابدی قدروں میں شمار کیا ہے آزادی ایک پیچیدہ اور کسی قدر غیر واضح مفہوم میں ہو سکتا ہے۔ آزادی میں بھی کچھ اسی قسم کی پیچیدگی ہے۔ مگر اپنی جگہ آزادی ایک نہایت ہی روشن حقیقت ہے۔ آزادی نراج کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر نراج اور آزادی میں فرق ہے۔ نراج، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے بے اصولے پن کا نام ہے۔ آزادی کے لئے بھی یک گونہ قید و بند درکار ہے۔ اگرچہ اس نوع کی پابندگی کو قید و بند

کہنا اس کی ماہیت سے بے خبری کا اظہار ہے۔ پابندی دراصل وہ ہے جو ذات سے الگ باہر سے کسی چیز پر عاید کیجائے اپنی ذات، اپنی صفات اور اپنے امکانات کی پابندی بہرحال ہر جگہ ہوتی ہے اور ہر چیز کو کرنا پڑتی ہے۔ مگر یہ پابندی کہے جانے کی مستحق نہیں۔ آب و باد اور خاک و آتش سے لیکر ابر و برق اور شمس و قمر تک کائنات کے تمام مظاہر و مناظر اپنے ذاتی قوانین و اصول کے تابع ہیں اور اپنے اپنے حدود اور قیود کے اندر رہ کر راہ ترقی پر رواں دواں ہیں۔ کوئی ان کو پابند یا مضطر نہیں کہتا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ خود خالق کائنات بھی اپنے اصول اور قاعدوں کا پابند ہے۔ اور اپنی سیرت و سنت کی راہ سے انحراف نہیں فرماتا۔

"لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً" (تم کبھی خدا کی سنت (قانون) میں کوئی رد و بدل نہ پاؤ گے)

ہستی خود ایک طرح کی قید ہے۔ پانی کی روانی ہر چند اس کی آزاد روی کی ایک نشانی ہے مگر اس سے جو لہریں بنتی نظر آتی ہیں وہ حلقہائے زنجیر کی مثال اس کو پابند سیلان بناتی ہیں۔ غالب نے کیا خوب کہا تھا:

کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی،

اس اعتبار سے خدا اور انسان کی پابندی میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ خدا کی تمام پابندیاں اپنی پیدا کردہ اور اپنی ہی عاید کردہ ہیں۔ مگر انسان جن اصول و قوانین کا پابند ہے ہر چند وہ اس کی ذات اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں اور باہر سے اس پر بار نہیں کئے گئے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اس کی اپنی تخلیق کا ثمرہ نہیں۔ خالق کائنات نے اسکی فطرت کو ان قوانین کا تابع بنایا ہے۔ اور اگر وہ ان سے سرتابی کرنا چاہے تو یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ شاید قرآن کی اس آیت کا مفہوم بھی یہی ہے:

"انا کل شیٔ خلقناہ بقدر" (ہم نے ہر چیز کو ایک ناپ اور اندازے سے بنایا ہے)

اور غالب نے انسان کی اس عجز اور نارسائی ہی کی بابت کہا تھا:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا

ہر چند انسان قوانین فطرت اور اصول اخلاق کا پابند ہے۔ مگر پھر بھی اسلام نے اس کو ایک بے اندازہ آزادی سے سرفراز کیا ہے۔ ایک بڑی آزادی جس سے وہ اب تک محروم چلا آیا تھا، یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت و رسالت ختم ہو جانے کے باعث اب وہ کسی دوسرے انسان کے القاء، روحی، الہام، اور رائے کا پابند نہیں۔ سوسائٹی کا کوئی فرد، خواہ وہ دولت و ثروت، شخصی اثر و نفوذ، سیاسی اقتدار اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے کتنا ہی ممتاز کیوں نہ ہو۔ سوسائٹی میں کسی ایسے مقام کا مالک نہیں جہاں سے وہ امر و نہی کر سکے۔ بے زبان گلہ کی طرح انسانوں کے انبوہ کو اپنے سامنے ہنکا سکے۔ یا چشم و ابرو کے اشاروں پر ان کو چلا سکے۔ اس قسم کا ذہنی یا مادی اقتدار اس آزادی کے منافی ہے جو ہر فرد مسلم کو اسلامی سوسائٹی میں حاصل ہے اور جس کا احترام اسلام نے بہرحال ضروری قرار دیا ہے:

از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن ، ناتراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

یہاں سے مساوات کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ افراد انسان اسلام کی نگاہ میں ایک جیسے ہیں۔ کسی کو دوسرے پر کسی قسم کی برتری حاصل نہیں۔ یا اگر حاصل ہے تو اس سے یہ ناجائز فایدہ اُٹھانے کی اجازت نہیں کہ وہ اپنے جیسے انسان کو غلام بنائے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسان، انسان سب برابر ہیں۔ سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ "الناس بنو آدم وحواء" قرآن شریف میں جو افراد انسان کی بابت بار بار فرمایا گیا ہے کہ خدا نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا۔ اس کا منشاء غالباً یہ ہے کہ افراد انسان یا اسلامی معاشرہ کے ارکان کی ذاتی، طبعی اور ذہنی مساوات پر زور دیا جائے۔ مساوات کے لفظی معنی ہیں یکسانی اور برابری اور ہر چند فضل و کمال علم و دانش اور ذہنی و روحانی اکتسابات کے اعتبار سے ممکن نظر نہیں آتا کہ سب برابر ہوں اور ان میں کسی طرح کا تفاوت پایا ہی نہ جائے۔ تفاوت ہو سکتا ہے اور ہے۔ لیکن یہ تفاوت وہبی نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ فطرت نے کسی ایک فرد کو بھی دوسرے سے ممتاز پیدا نہیں کیا۔ نہ کسی ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں بے پایاں صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ ہر شخص ایک جیسی صلاحیتوں کو لے کر وجود میں آیا۔ ہاں اگر وہ ان صلاحیتوں سے کسی دوسرے کی نسبت زیادہ کام لے تو وہ اتنا ہی زیادہ دوسرے سے ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھ سکتا ہے۔ یہ در اصل عطا کردہ قابلیتوں کو چمکانا اور جلا دینا ہے۔ ان سے برمحل کام لے کر ان کو مستحکم اور استوار بنانا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اختیاری چیز ہے۔ اسلام نے اس تفوق اور افضلیت کی راہیں بھی متعین فرما دی ہیں۔ اور وہ راہیں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایسی ہیں جن پر ہر شخص اپنی خوشی سے رہ سپری کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر کلام الٰہی میں یہ اُصول بیان کیا گیا ہے کہ خدا کے نزدیک افضل وہی ہے جو دوسرے کے مقابلہ میں گناہ سے بچنے میں زیادہ احتیاط برتتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ گناہ سے بچنا ہم سب کے لئے یکساں ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص کچھ اپنی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے کسی قدر آسانی کے ساتھ گناہ سے اجتناب کر سکتا ہے اور چونکہ ذاتی صلاحیتوں سے سب یکساں طور پر فیضیاب ہیں اس لئے اسلامی مساوات کا ایک اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک فرد واحد اس کے نزدیک پوری سوسائٹی کا حاکم بھی نہیں۔ حکومت بھی ایک طرح کی خدائی ہے۔ یا اگر خدائی نہیں تو خداوندی ہے۔ خدائی اور خداوندی میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ خداوند کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں یا حاصل سمجھے جاتے ہیں جو در اصل خدا کے اختیارات ہیں۔ عربی زبان میں خداوند کا صحیح ترجمہ رب ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ فرعون نے اپنی رعایا سے یہی کہا تھا کہ "انا ربکم الاعلیٰ" (میں تمہارا خداوند بزرگ ہوں)۔ اس نے رب، خداوند، حاکم آقا اور مالک ہی کے معنیٰ میں استعمال کیا تھا۔ ثبوت یہ ہے کہ خود فرعون کے معبود بھی تھے جنہیں وہ اپنے سے برتر سمجھتا تھا اور آل فرعون سب ان کے سامنے بندگی کا اظہار کرتے تھے۔

قرآن میں ہے :۔

قال الملأ من قوم فرعون اتذر موسیٰ وقومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک وآلھتک

قوم فرعون کی ایک پارٹی نے فرعون سے کہا کہ کیا آپ موسیٰ اور ان کی جماعت کو اتنی آزادی دیتے ہیں کہ وہ فتنہ وفساد کرتے پھریں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو ٹھکرادیں۔

عبدیت یا بندگی کے معنی ہیں غیر مشروط اطاعت۔ ہم غیر مشروط پر جس کی اطاعت بھی کریں ہم دراصل اسکے بندے ہیں اور وہ ہمارا رب۔ ہمارا الٰہ اور ہمارا معبود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ زبان سے ہم اسے رب یا معبود نہ کہیں۔ یہود کی بابت قرآن نے فرمایا ہے: "اتخذوا احبارہم ورھبانہم اربابا من دون اللہ"۔ (ان لوگوں نے اپنے عالموں اور عابدوں کو رب بنا رکھا ہے) — حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ زبان سے انھوں نے کبھی نہ کہا کہ انکے عالم ان کے رب ہیں۔ بلکہ وہ ان کی ہر بات مانتے تھے اور ہر معاملے میں ان کی نامشروط اطاعت کیا کرتے تھے۔ ان کی نگاہ میں حق وراستی کا معیار ہی یہ تھا کہ جو کچھ ان کے عالم کہیں وہ حق ہے۔ اور جس سے وہ باز رکھیں وہ باطل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہود درحقیقت اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ ان کی ہر بات بے چون وچرا مان لیتے تھے (ملاحظہ ہو بخاری شریف) — اس نوع کی طاعت وبندگی صرف اس معبود حقیقی ہی کیلئے سزاوار ہے۔ البتہ اس کے نائب یعنی انبیاء اور رسل بھی اس طاعت کے مستحق ہیں۔ اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ دراصل ان کی طاعت اُس معبود حقیقی ہی کی طاعت ہے۔

"من اطاع الرسول فقد اطاع اللہ"۔ (جس نے رسول کی اطاعت کی اسنے دراصل خدا کی اطاعت کی)۔ مگر اسلام نے انبیاء کے اس سلسلہ کو منقطع کرنے کے بعد گویا اس نوع کی طاعت ہی کا خاتمہ کردیا۔ اب نامشروط اطاعت خدا کے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔ نہ نیابۃً اور نہ اصالۃً۔ اسلام نے ہم کو مساوات کا جو سبق دیا ہے اس نے ہمیں تمام بندگیوں سے آزاد کردیا ہے ؎

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

خدا کے حضور میں سجدہ ریزی نے مسلمان کو ہزار نیازمندیوں سے بے نیاز بنادیا ہے ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسلام کا اعلیٰ مقصد حقیقۃً عدل وانصاف کی تبلیغ ہے۔ اور اگر اسلام نے کبھی تلوار اُٹھائی تو زبردستی اسلامی عقائد منوانے کے لئے نہیں بلکہ عدل وانصاف کی اشاعت کے لئے، ظلم وجور کی بنیادیں اُکھاڑ پھینکنے کے لئے اور ایک انسان کو دوسرے کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے۔ مسلمانوں کے سفیر زہرہ نے جو ایک جلیل القدر صحابی بھی تھے۔ اہل فارس کے مشہور سپہ سالار سے کہا تھا کہ اسلام کی تبلیغ کا مقصد ہے:۔

"اخراج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ" (تمام بندگان خدا کو ان جیسے بندوں کی غلامی سے نکالکر خدا کے حضور میں جھکانا)

ربعی بن عامر نے اسی سفارت کے سلسلہ میں مقاصد اسلام پر تقریر فرمائی اور اس ضمن میں یہ بھی کہا:

"قد بعثنا اللہ لنخرج من نشاء من عبادہ من ضیق الدنیا الیٰ سعتہ ومن جور الادیان الیٰ عدل الاسلام"۔

خدا نے ہمیں اس امر کے لئے مامور فرمایا ہے کہ ہم اسکے بندوں کو دنیا کی تنگیوں سے نکال کر اس کی وسعتیں عطا کریں۔ اور دوسرے ادیان کی زیادتی سے بچا کر اسلام کے عدل تک پہونچائیں۔

اسی ایرانی سفارت کے سلسلہ میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس نے اسلامی مساوات کا نقش لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا۔ اب وہ نقش کچھ دھندلا سا ہو گیا ہے۔ اس لئے علامہ اقبال اسے اُجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی سفارت کے رئیس مغیرہ بن شعبہ جب ایرانی جرنیل رستم کے دربار میں پہونچے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک زریں تخت پر زرق برق لباس زیب تن کئے بیٹھا ہے۔ اور تخت کے چاروں طرف ایرانی سردار ادب کے ساتھ سر جھکائے اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں۔ مغیرہ تخت پر چڑھ گئے اور رستم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گئے۔ ایرانی سرداروں نے انھیں یہ کہکر تخت سے اُتار دیا کہ آپ ہمارے امیر کے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ اس موقعہ پر مغیرہ نے فرمایا:

ما ارئ قوماً اسفہ احلاماً منکم، انا معشر العرب لا یستعبد بعضنا بعضاً وانی رائیت ان بعضکم ارباب لبعض۔ وان ہذا الامر لا یستقیم فیکم۔

(اے ایرانیو) میں نے تم سے زیادہ کم عقل کوئی قوم ہی نہیں دیکھی۔ ہم عرب لوگ ایک دوسرے کی بندگی نہیں کرتے ہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اپنے جیسے انسان کو اپنا خداوند بنا رکھا ہے۔ یاد رکھو تم کبھی اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکو گے) ــــ کہاں تک تفصیل کی جائے۔ اسلامی تعلیمات کی روح عدل و مساوات ہے اور اسکی تشریح و تفصیل قرآن حکیم اور حضور اکرم کے ارشادات میں ہزار طرح سے کی گئی ہے۔

ناشکیب امتیازات آمدہ در نہاد اُو مساوات آمدہ

عدل کا تعلق ذات سے نہیں غیر ذات سے ہے۔ ذات اور غیر ذات کے تعلق سے حقوق میں جو ایک طرح کی آویزش ہو جاتی ہے۔ عدل اسکو رفع کر دیتا ہے۔ یہ ایک نوع کی میزان ہے جس میں حقوق کا وزن کیا جاتا ہے۔ سوسائٹی کی تمام بے آئینیاں اور ناہمواریاں میزان عدل چھوڑ دینے ہی سے رونما ہوتی ہیں۔ قوموں کے باہمی اختلافات بھی اسی وجہ سے ہیں کہ عدل کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ عدل ایک طرح کی میانہ راہ ہے جسے قرآن شریف میں "صراط مستقیم" کہا گیا ہے۔ حضرت اکرم کو امر فرمایا گیا تھا "فاستقم کما اُمرت" (آپ راہ راست سے انحراف نہ فرمائیں) قرآن حکیم نے حضرت کی زبانی یہ اعلان بھی فرمایا: "امرت لاعدل بینکم" (اے لوگو) مجھے عدل قایم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے)۔ عدل قایم رکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ صبر کی طرح عدل بھی ایک نہایت تلخ حقیقت ہے جسے حلق سے نیچے اُتارنا بہت دشوار ہے۔ عدل اور جذبات میں بیر ہے۔ انسان جذباتی حیوان ہے۔ اس لئے عدل و انصاف کے تمام زریں اصول اس کے یہاں جذبات کے بے پناہ سیلاب میں بہ جاتے ہیں۔ عدل کی ضد جور اور اس کے ہم معنی الفاظ ظلم، عدوان، فرط وغیرہ ہیں۔

قرآن میں ہے: "لایجرمنکم ن قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا" (اگر کسی قوم سے تمہاری عداوت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مسجد حرام میں داخل ہونے سے تمھیں روکا۔ مثلاً (کفار مکہ) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ظلم و عدوان جیسے جرم کا ارتکاب کرو) ۔ اسی کے بعد اسی سلسلہ میں یہ آیت ہے: "لایجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا، اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ" (کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس کا مجرم بنائے کہ تم بے انصافی کرو۔ تم ہمیشہ انصاف کرو۔ وہ تقویٰ سے تمھیں قریب تر کر دے گا) ۔ قسط عربی میں عدل ہی کو کہتے ہیں۔ جس طرح انسانی مزاج کے لئے مختلف اور متضاد کیفیات کے درمیان اعتدال کی ضرورت ہے اسی طرح اقوام کے مزاج میں بھی عدل و قسط ہی سے اعتدال قایم رکھا جاتا ہے۔ اور کبھی اس غرض کے لئے نہایت تلخ جرعے حلق سے نیچے اُتارنا پڑتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کو اسکی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر اور ذاتی منفعتوں کو ٹھکرا کر دوسرے لوگوں کے مفاد کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

"یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ، ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین" (اے مومنو! انصاف کا دامن پکڑے رہو۔ اور خدا کے لئے گواہ رہو۔ اگرچہ تمھیں اس راہ میں اپنے ماں اور باپ اور اپنے قریبی اعزہ کے خلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے) ۔ اس کے بعد یہ الفاظ کتنے جامع اور حقیقت افروز ہیں: "فلا تتبعوا الھویٰ ان تعدلوا" (عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے اپنی خواہشوں کی پروا نہ کرو) ۔ اقبال فرماتے ہیں:-

عدل در قہر و رضا از کف مدہ، قصد در نقر و غنا از کف مدہ
حکم دشوار است، تاویلے مجو جز بقلب خویش قندیلے مجو

حق ان تمام ابدی قدروں کا جامع ہے۔ وہ ایک ایسا تخم ہے جس میں یہ سب قدریں نہاں ہیں اور اس کے بار ور ہونے کے ساتھ ہی عیاں ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے ان قدروں کو باقی مانا ہے۔ اسکے علاوہ سب کچھ اسکے نزدیک آنی اور فانی ہے۔ رواں و دواں ہے۔ متحرک اور گزراں ہے۔ اجتہاد وہ پیمانہ ہے جس سے مرد مومن ان گزراں حقیقتوں کو ناپتا ہے اور یہ اندازہ لگاتا ہے کہ اب وہ ارتقاء کی کن منزلوں میں ہیں۔ سیاسیات، اجتماعیات، معاشیات اور نظام حیات کے دوسرے شعبے سب اجتہاد کے زیر فرمان ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان کو چاہئے کہ وہ اجتہاد سے کام لے، ان منازل کو دریافت کرے جو ان شعبوں نے حیات کے ساتھ طے کی ہیں، اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مناسب ترمیم و تنسیخ اور اضافہ کرے قلب آگاہ ہی ہے جو قندیل کی طرح باطن انسان کو روشن کرتا ہے۔ اس روشنی میں انسان کے سامنے مستقبل کی سب راہیں آئینہ ہو جاتی ہیں۔ اقبال کا یہ قول:- "جز بقلب خویش قندیلے مجو" — صحیح اور سچی تعبیر ہے حضور اکرم کے اس ارشاد مبارک کی "استفتِ قلبک" (اپنے قلب سے فتویٰ طلب کر) ۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنکھ اور کان کے ساتھ ہی قلب سے بھی قیامت کے روز سوال کیا جائے گا۔ مسلمان کی شان ہے:

کیش ما مانند موج تیز گام اختیار جادۂ ترک مقام شوکت سبزواری

مکتوبات نیاز

قبلہ ، میں اب کہاں جس سے آپ جواب کی توقع رکھتے ہیں ۔غم کی عظمت کا پتہ اب چلا ہے، جب نہ اس کی لذت کی تاب باقی رہی نہ تکلیف سے تڑپنے کی سکت !

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

غالب کا یہ شعر بارہا نگاہ سے گزرا، لیکن جو تلخی اس میں پنہاں ہے، اس کی حقیقت اب ظاہر ہوئی ۔ معاذ اللہ

می سوزم و از سوختنِ خود خبرم نیست

حزیں نے ایک بار اپنے انتہائی درد و کرب کا اظہار یوں کیا تھا

دل بیمار خود را بر کدا میں بستہ اندازم

لیکن یہاں تو بالش و بستر کا خیال بھی تکلیف دہ ہے، آرام و سکون کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے ۔ آپ نے جو صورتیں اندمال جراحت کی تحریر فرمائی ہیں، وہ سب درست، لیکن شاید آپ کو اس کا علم نہیں کہ

ایں سینہ ہمہ بدوختن رفت

آپ کب تک تسلیوں کے فریب میں مبتلا رکھیں گے اور میں کب تک دُنیا سے چھپ کر آنسو بہاتا رہوں گا ـــ آہ،

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

اور وہ آفتاب اب طلوع ہونے والا نہیں ـــ !

معاف فرمائیے، گرامی نامہ کے جواب میں بہت تاخیر ہوئی ۔ میں تو ہمیشہ اس زمانہ کو یاد کروں گا، جب ہمارے بچے "جورِ اُستاد" سہتے تھے اور پڑھیں یا نہ پڑھیں لیکن اخلاق ان کے ضرور سدھر جاتے تھے ۔ اب اساتذہ خود "جورِ تلامذہ" سے ہر وقت خائف رہتے ہیں، جو حال ہے، وہ یونیورسٹیوں کے احاطوں میں جا کر دیکھئے ۔ انگریزی تعلیم بجائے خود بُری نہیں، لیکن جس مقصد کے لئے جن حالات میں اسے حاصل کیا جاتا ہے، وہ یقیناً افسوسناک ہے ۔ آپ اگر میری رائے مانیں تو اپنے بچہ کی تعلیم اسی نہج پر کرائیے جو آپ کے لئے اختیار کیا گیا

تھا۔ فارسی عربی دونوں کی اگر تکمیل نہ ہو سکے، تو کم از کم اتنا وقوف ضرور ہونا چاہئے کہ ان زبانوں کے الفاظ کا صحیح مصرف سمجھ سکے، ورنہ اپنی زبان بھی اچھی طرح نہ آئے گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا آجکل بعض مشہور شعراء بھی فارسی عربی کی عدم واقفیت کی وجہ سے، تراکیب اور محل استعمال میں کیسی کیسی غلطیاں کر جاتے ہیں۔

تیرہ چودہ سال کی عمر تک یہ تعلیم ختم ہو جائے گی، اس کے بعد آپ انگریزی پڑھا سکتے ہیں، لیکن اسکولوں اور کالجوں کی نہیں، بلکہ ادیبوں اور عالموں کی، یعنی مقصود امتحان پاس کرنا نہیں، بلکہ واقعی زبان اور اس کے نکات پر عبور حاصل کرنا ہو۔ اور پھر ایک انگریزی ہی پر کیا موقوف ہے، مغرب کی اور زبانوں کو بھی آپ لے سکتے ہیں، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ سنسکرت کیوں نہ لیجئے۔ آپ کو اس سے نوکری تو کرانا نہیں اور اگر مقصود یہ بھی ہو، تو اب زمانہ بہت بدل گیا ہے اور چند سال بعد محض انگریزی دانی کو کوئی نہ پوچھے گا۔

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آیندہ زندگی کس مشغلہ میں بسر کرنا ہے۔ وراثتاً جو ذہنیت اس میں منتقل ہوئی ہوگی، اس کے پیش نظر تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ آپ کی طرح اس کو بھی اچھا تاجر بننا چاہئے اور چونکہ اس کی تعلیم کے لئے خود آپ اور آپ کا موجودہ کاروبار کافی ہے، اس لئے مناسب یہی ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے تجارت کے نکات سے بھی آگاہ کرتے رہئے اور جب اس میں کچھ سمجھ پیدا ہو جائے تو دہلی کی شاخ میں اسے کچھ اختیارات دیکر بھیج دیجئے۔ یہ ہے میری رائے آپ کے بچہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق، لیکن اگر آپ اس کے بعد بھی اسکول و کالج ہی کی تعلیم مناسب سمجھتے ہیں، تو پھر اسے ہندوستان سے باہر بھیج دیجئے، اگر وہ مشرق کا نہیں بنتا تو مغرب ہی کا بنے۔

گرامی عزیز۔ یہ معلوم کرکے کہ آپ عہد مغلیہ کی فارسی شاعری پر مقالہ مرتب کر رہے ہیں، کیا کہوں، کتنی مسرت ہوئی۔ میں اس باب میں آپ کی ہر ممکن مدد کے لئے آمادہ ہوں، گو آپ کو اس کی ضرورت نہیں، عرفی اور نظیری یقیناً بہت زیادہ قابل توجہ ہیں۔ آپ مجھ سے ان کے چند ایسے بہترین اشعار چاہتے ہیں، جن سے ان دونوں کا رنگ شاعری متمایز ہو سکے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن ایک چیز عرفی کے یہاں زیادہ نمایاں ہے، جوش بیان اور اسی کے ساتھ استدلال کی شاعرانہ قوت۔ جذبات دونوں کے یہاں ہیں، لیکن عرفی کے یہاں تلخی اور گہرائی زیادہ ہے اور نظیری کے یہاں سادگی، فتادگی اور معاملہ بندی — انداز بیان میں تیکھا پن دونوں میں پایا جاتا ہے لیکن عرفی کا تیکھا پن ذرا پیچیدگی لئے ہوئے ہوتا ہے اور نظیری کا شوخی سے آگے نہیں بڑھتا۔ ذکر آگیا ہے تو کچھ مثالیں بھی پیش کر دوں۔

عرفی کے بعض مشہور اشعار جن سے اس کے جوش بیان اور قوت استدلال کا پتہ چلتا ہے،

ملاحظہ ہوں:

عشق اگر مرد ست، مردے تاب دیدار آورد ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد

عارف ہم از اسلام خراب ست وہم از کفر پروانہ چراغ حرم و دیر نداند،

گماں مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگزشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

حدِ کنہ تو بہ ادراک نشاید دانست ایں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من ست

برو پیالۂ خونیں بخر ز قصاباں، مشو گدائے شباناں کہ شیر می دوشند

پہلے اور آخری شعر کو آپ اسی جوش کے ساتھ پڑھئے، جس جوش کے ساتھ عرفی نے انھیں کہا ہے تو آپ یقیناً ان میں تغزل کی کیفیت بالکل محسوس نہ کریں گے، بلکہ اس کو خطیبانہ شاعری میں جگہ دیں گے، جو نظیری کے یہاں بالکل نہیں پائی جاتی - چوتھے شعر میں جوش نہیں ہے بلکہ محض ندرت بیان ہے اور تغزل سے دور، لیکن نظیری جب اس قسم کے ندرت بیان سے کام لیتا ہے تو اس کا رنگ تغزل اور زیادہ لطیف ہوجاتا ہے مثلاً:

گرچہ می دانم قسم خوردن بجانت خوب نیست ہم بجانِ تو کہ یادم نیست سوگندِ دگر

"ہم بجانِ تو" کہکر کس خوبی کے ساتھ اس نے "یادم نیست سوگندِ دگر" کا ثبوت پیش کیا ہے، اور کتنی ربودگی و فتادگی سے اس نے کام لیا ہے۔

عرفی کے دوسرے اور تیسرے شعر میں یقیناً غزل کی سادگی و بیساختگی پائی جاتی ہے، لیکن عاشقانہ جذبات سے معرّا ہے، برخلاف اس کے نظیری کا ایک شعر سنئے جو عرفی کے دوسرے شعر کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے:

دو نیم گشتہ دل از کفر و دیں، نمی دانم کزیں دو پارہ دل آید ترا بکار کدام،

کس درجہ لبریز جذبات ہے!

اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ عرفی کے یہاں عاشقانہ جذبات کی کمی ہے، لیکن ان کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں جذبات کے ساتھ جوش بھی ملا ہوا ہے، مثلاً

بیا اے عشق رسوائے جہانم کن کہ یک چندے نصیحتہائے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

نخورم زخم دراں کوچہ کہ مرہم باشد نشوم کشتہ دراں شہر کہ ماتم باشد

تہنیت جز بر مصیبت در طریق ماست ننگ عہد را در شہر ما رسم مبارکباد نیست

ہر گاہ گفتہ ایم کہ عرفی اسیر کیست آہ از نہاد گبر و مسلماں بر آمدہ

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا عرفی کے جذبات عشق میں تلخی زیادہ ہے اور اس کا ثبوت مذکورۂ بالا شعر سے ملسکتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں سادگی، فتادگی اور برشتگی بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اور عرفی کا یہی وہ رنگ ہے جس میں اُس کے اور نظیری کے درمیان امتیاز مشکل ہو جاتا ہے مثلاً:

خوش آں ساعت کہ می رفتی و طاقت می رمید از من
تغافل از تو می بارید و حسرت می چکید از من

امروز نگاہ من و عرفی بہم افتاد، باہم نگریستیم، و گریستیم و گزشتیم
تمام بود بیک حرف گرم و ما غافل، حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند،
گر کام دل بہ گریہ میسر شود ز دوست، صد سال می توان بہ تمنا گریستن

اب چند اشعار نظیری کے بھی اسی رنگ میں ملاحظہ ہوں:

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم
تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست
تا منفعل ز رنجشِ بیجا نہ بنمیش، می آرم اعتراف گناہِ نبودہ را،
دل شکستہ دراں کوئے می کنند درست چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

آپ اگر غور کریں گے تو باوجود تغزل کی یکرنگی کے دونوں کے کلام میں فرق نظر آئے گا، اور وہ غالباً وہی ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ عرفی کے یہاں تلخی جذبات زیادہ ہے اور نظیری کے تغزل میں روانی و سادگی کی فراوانی ہے۔

عرفی کے کلام میں چونکہ شکوہِ الفاظ بھی زیادہ پایا جاتا ہے جو پرجوش طریق اظہار کے لئے ضروری ہے، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ عرفی قصاید میں جتنا کامیاب نظر آتا ہے، تغزل میں نہیں اور نظیری صرف غزل کا شاعر تھا اور تغزل کی تمام خصوصیات انتہائی خوبی کے ساتھ اس کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن میری یہ رائے ایسی نہیں جس پر اعتماد کر کے آپ اپنی تحقیق و جستجو کا مرکز بدل دیں ہوسکتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں اور آپ زیادہ عمیق تحقیق کے بعد کسی اور نتیجہ پر پہونچیں۔

حضرت نیاز کے قلم سے دو جدید مطبوعات

جھانسی کی رانی (ڈرامہ) عہ ۴ ——— اصحاب کہف (ڈرامہ) عہ ۱۲

قدیم سنسکرت لٹریچر

(بہ سلسلۂ ماہ نومبر ۴۶ء)

فضائی دیوتاؤں میں ایک دیوتا ہوا کا بھی ہے جس کو رگوید میں دو طرح یاد و نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ایک وایو اور دوسرا وات - (فارسی باد)۔ تین مکمل بھجن اُس کے نام پر ہیں جب وایو کی حیثیت سے اُس کا ذکر آتا ہے تو اُسکی شخصیت علٰحدہ طور پر زیادہ نمایاں نظر آتی ہے، لیکن وات کے ذکر میں عنصر مادی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ عموماً وایو کا اندر کے ساتھ تعلق ہے اور وات کا (جو معمولی نام ہوا کا ہے) بارش کے دیوتا پرجنیا سے ——— وایو خیال کے مانند تیز ہے اور رعد انگیز سرعت کا مالک ہے۔ اور اُس کے چمکتے ہوئے رتھ کو سُرنگ گھوڑوں کی ایک یا کئی جوڑیاں کھینچتی ہیں۔ اس رتھ کی بیٹھک کی جگہ سنہری ہے اور آسمان سے مَس کرتی ہے۔ اُس کے ساتھ اِندر کی نشست بھی وہیں ہے۔ لفظ وات کی اصل وا ہے جس کے معنی ہیں ہوا کا چلنا (ملاحظہ ہو فارسی مصدر وزیدن اور فارسی لفظ وا گشادہ ہونا یا کھلنا)۔ اسی اصلی معنی کے اعتبار سے رگوید میں وات کا ذکر عموماً کیا گیا ہے۔ اُس کے گھر میں خزانۂ بقا ہے۔ وہ زندگی کو بڑھاتا ہے اور شفا کو ہوا کے ذریعہ سے پہونچاتا ہے۔ اُس کی توصیف رگوید کے الفاظ ہی میں سنئے (منڈل ۱۰ سوکت ۱۶۸)

بند (۱)

"اب میں وات کے رتھ کی عظمت و شان کی تعریف کرتا ہوں۔

ہر چیز کو کچلتا روندتا ہوا وہ تیزی سے رواں ہے اور رعد اُس کا شور و غوغا ہے۔

وہ آسمان کو چھوتا ہوا جا رہا ہے اور بجلیاں برسا رہا ہے۔

زمین کی گرد و غبار کو منتشر کرتا ہوا وہ تیزی سے بڑھا چلا جا رہا ہے۔"

بند (۲)

"ہوا (فضا) میں وہ اپنے مقررہ راستوں پر عجلت کے ساتھ آگے آگے بڑھا چلا جا رہا ہے۔ کسی روز بھی کسی مقام پر ٹھہر کر وہ آرام نہیں کرتا۔

مولود اوّلین۔ ریت اور ترتیب کا عاشق۔ وہ آب ہائے (آسمانی) کا دوست ہے۔

فرمائیے وہ کہاں پیدا ہوا اور کہاں سے اس طرف آیا۔"

بند (۳)

"یہ دیوتا دیوتاؤں کی روح اور کائنات کی اولاد ہے۔
اور جیسا اُس کا مزاج چاہے اِدھر اُدھر گھوما کرتا ہے۔
اُس کی آواز سننے میں آتی ہے لیکن اُس کی شکل کبھی دیکھنے میں نہیں آتی۔
اب (حمد و ثنا کے بعد) ہم کو اُس کی پوجا نذر نیاز (پیش کش) کے ساتھ کرنی چاہیئے۔"

پرجنیا۔ (جس کا ذکر "دات" کے سلسلہ میں آیا ہے)۔ بارش کا دیوتا ہے۔ یعنی اگر بارش کی کوئی شخصیت قرار دیجائے تو ایسی شخصیت پرجنیا ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اکثر دیوتا اسی نوعیت کے ہیں۔ اس دیوتا کے نام پر رگ وید میں صرف تین بھجن ہیں اور اُس کا نام ساری کتاب میں تیس مرتبہ آیا ہے۔ اکثر مقامات پر اس لفظ کے استعمال سے صرف برسنے والا بادل ہی مراد ہے۔ اس لئے طوفانی بارش کا جو سماں نظر آتا ہے پرجنیا اُس کی نمایندگی کرتا ہے۔ پانی سے بھرے ہوئے بادل کبھی گائے کے تھن ہوتے ہیں۔ کبھی بالٹی اور کبھی مشک۔ پرجنیا بیل کی طرح ہے اور پانی برساتا ہے۔

رگ وید میں پانی کا ذکر عموماً جمع کے صیغہ میں کیا گیا ہے۔ گویا طرح طرح کے پانی ہیں۔ چار بھجنوں میں اُن کو دیویوں کی شکل میں سراہا گیا ہے۔ اُن کی شخصیت کبھی ماؤں کی شکل میں اور کبھی جوان بیویوں کی صورت میں ظاہر کی گئی ہے اور کبھی وہ ایسی دیویاں ہیں جو مرادیں پوری کرتی ہیں اور قربانگاہ میں یعنی پوجا کی جگہ نذر و نیاز کے وقت حاضر آتی ہیں ماں کی حیثیت سے اونسی اگنی برق کی اُس شکل میں پیدا ہوتا ہے جس کو اَپامُ نپاتؔ (پانی کا لڑکا) کہتے ہیں یہ آسمانی گندگی کو دور کرنے والی ہیں۔ اور اخلاقی معصیت سے بھی پاک وصاف کرنے کی اُن سے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ یہ دوا و شفا بخش ہیں۔ زندگی بڑھاتی ہیں اور بقا عنایت کرتی ہیں۔ "سَوم" ان پانیوں سے ایسی مسرت حاصل کرتا ہے جیسا کوئی نوجوان مرد حسین دوشیزہ لڑکیوں سے۔ سوم اُن کی طرف عاشق کی طرح متوجہ ہوتا ہے اور وہ ایسی لڑکیاں ہیں جو جوانی کے آگے جھک جاتی ہیں۔ پانی کی طرح کئی ندیاں بھی رگ وید میں دیویوں کی شکل میں مخاطب کیگئی ہیں۔ ایک بھجن (منڈل ۱۰ سوکت ۷۵) دریائے سندھو (اِنڈس) کی ثنا و صفت میں ہے دوسرا (منڈل ۳ سوکت ۳۳) وِپاش (بیاس) اور شُتُدری (ستلج) کی توصیف میں ہے۔ مگر سب سے اہم دریائی دیوی سرسوتی ہے جس کی تعریف میں تین مکمل بھجن ہیں۔ دیگر مقامات پر بھی اُس کا ذکر ہے۔ اگرچہ اِلٰہ دیوی کا تعلق اسی دریا سے ہے لیکن اُسکی شخصیت ندی سے بالکل علٰحدہ ہے۔ یہ بہترین ندی ہے۔ بہترین مادر ہے اور بہترین دیوی ہے۔ اُس کی چھاتیاں بے نہایت دولت کا خزانہ ہیں اور وہ دولت۔ اجناس۔ غذا اور اولاد کی نعمتیں عطا کرتی ہے۔ اُس سے التجا کی جاتی ہے کہ وہ آسمان سے اور بڑے پہاڑوں سے نیچے اُتر کر پوجا اور نذر و نیاز میں شریک ہو۔ (ویدی زمانہ کے بعد کے مذہبی

افسانوں میں گنگا کا آسمان سے نازل ہونا رگوید کے شاید اسی قسم کے شاعرانہ عقاید پر مبنی ہو) بہر حال رگوید میں سرسوتی محض ایک دریائی دیوی ہے۔ لیکن براہمنڑوں میں اُس کو نطق کی دیوی ودیا چ کا مترادف قرار دیدیا گیا اور ویدی زمانہ کے بعد کے مذہبی افسانوں میں وہ فصاحت و فراست کی دیوی کی شکل میں برہما کی بیوی مان لی گئی۔ اس وقت اُس کی صفات میں علم کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

دو عالموں کا ذکر تو ہوچکا۔ تیسرا عالم ارضی ہے جس کی نمایندگی پرتھوی کرتی ہے۔ رگوید میں اُس کی تسبیح میں صرف ایک بھجن تین بندوں کا ہے۔ بجز ظاہری ارضی کیفیات کے اس دیوی کی صفات کے تذکرہ میں کسی علٰحدہ نوعیت رکھنے والی شخصیت کا اظہار نہیں ہوتا اور اُس کے ذکر کے ساتھ ہی ساتھ دیوس کا ذکر بھی ضرور آجاتا ہے ایک بند کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"وہ مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہے اور اپنی طاقت سے جنگل کے درختوں کو زمین میں سنبھالے رہتی ہے جبکہ تیرے بادل کی بجلیوں سے آسمانی بارش کا سیلاب زمین پر اُترتا ہے۔"

ارضی دیوتاؤں میں اہم ترین دیوتا اگنی ہے۔ یہ خداوند آتش یعنی آگ کا دیوتا ہے۔ ویدی دیوتاؤں میں اِندر کے بعد اسی کا درجہ بہت نمایاں ہے۔ اس کی حمد و ثنا میں دو سو سے زیادہ بھجن ہیں۔ اس امر کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ آریہ فرقہ ہندوستان میں دو رسمیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ ایک رسم یہ تھی کہ آگ روشن کرکے اُس پر گھی ڈالتے تھے۔ دوسری یہ تھی کہ آگ روشن کرتے تھے اور سوم رس اُسی وقت طیار کرکے کچھ آتش فروزاں پر ڈالتے تھے اور باقی پی جاتے تھے۔ اِن رسوم کے ادا کرتے وقت رگوید کے متعلقہ بھجن پڑھے یا گائے جاتے تھے اور اُنھیں موقعوں پر بیل۔ گھوڑے وغیرہ کی قربانی بھی ہوا کرتی تھی۔ قربان گاہ میں ایک بانس یا لمبی لکڑی گاڑ دی جاتی تھی۔ رگوید کے بھجنوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں آدمی بھی قربانی پر چڑھا دئے جاتے تھے۔ اس رسم کو یجن کہتے ہیں۔ پارسی (اوستی) زبان کا لفظ یسن بمعنی عبادت ہے اور پارسیوں میں بھی آگ کی پرستش ملتے جلتے طریق پر کیجاتی ہے۔ غرضکہ یجن کی رسم عام تھی۔ ایک گھریلو اور ایک پبلک۔ گھریلو رسم روزانہ ادا کی جاتی تھی اور اب بھی بدستور کی جاتی ہے۔ پبلک طور پر بھی یہ رسم قدیم زمانہ میں وقتاً فوقتاً کی جاتی تھی۔ حال میں اس کی مثال دہلی کا یجن ہے جس میں گھی کے علاوہ دیگر اجناس بھی نذر آتش کی گئیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ ہر اعتبار سے آگ کیسی ضروری اور اہم شے تھی (یعنی گھر کے لئے) اور یہ کہ رشیوں کی توجہ اسی طرف کیوں زیادہ پائی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر رشیوں کی شاعرانہ تخیل کا یہ عنصرِ لطیف کیونکر خاص مرکز قایم ہوا؟ واضح رہے کہ اگنی آگ کو بھی کہتے ہیں اور اگنی آگ سے الگ آگ کے دیوتا کا بھی بصیغۂ مذکر نام ہے۔ جسمانی حیثیت سے اگنی تقریباً ایسی ہی شکل و صورت رکھتا ہے جیسی آتشِ ارضی کی دکھائی دیتی ہے۔ جب گھی آگ پر ڈالا جاتا ہے اور اُسوقت اگنی کی صفات بیان کی جاتی ہیں تو کبھی وہ مکھن کا چہرہ رکھنے والا۔ کبھی مکھن کی پشت رکھنے والا اور کبھی

کھن جیسے بالوں والا کہا جاتا ہے۔ کبھی وہ شعلہ ہے اور اُس کی ڈاڑھی منہدی کے رنگ کی ہے۔ اُسکے دانت تیز اور چمکتے ہوئے ہیں کبھی طلائی کبھی آہنی۔ اُس کا جبڑا سوزان و سوزندہ ہے۔ اُس کی کئی زبانیں ہیں۔ وہ تشبیہاً اور استعارۃً ایک ایسا گھوڑا ہے جو بجن کے بانس میں اس لئے جتا ہوا ہے کہ نذر یا قربانی کو دیوتاؤں تک پہونچا دے۔ تشبیہاً وہ ایسا پرند بھی ہے جو اپنے پروں کے ذریعہ سے تیزی سے اُڑکر دیوتاؤں تک پہونچ جاتا ہے۔ وہ اپنے تیز دانتوں سے جنگل کے جنگل چبا کر کھا جاتا ہے۔ اُس کی چمک دمک آفتاب کی شعاعوں اور بادلوں سے چمکنے والی بجلیوں کے مانند ہے لیکن اُس کا راستہ اور اُس کی گاڑی کے پہیوں کی پٹھیاں سیاہ مطلق ہیں اور اُس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو نشان بنتے ہیں وہ بھی کالے ہیں۔ جب وہ جنگلوں پر حملہ کرتا ہے تو جس طرح حجام داڑھی صاف کر دیتا ہے اُسی طرح وہ موہائے ارضی کو اُڑا دیتا ہے۔ اُس کے شعلے سمندر کی پُرشور موجوں کی طرح ہیں۔ جب وہ جنگل کے درختوں پر حملہ آور ہوتا ہے تو بیل کی طرح ڈکراتا ہے۔ اور جب اُس کی سبزہ و نباتات کو نگل جانے والی چنگاریاں اُڑتی ہیں تو اُن کے خوف سے پرندے تھرا اُٹھتے ہیں۔ جس طرح کوئی شخص ستون سے کسی شے کو سہارا دیکر سنبھالتا ہو اُسی طرح اگنی آسمان کو اپنے دھوئیں سے سنبھالے ہوئے ہے۔ دُھانی پرچم والا اُس کا لقب ہے۔ وہ ایک روشن و متجلی رتھ میں سواری کرتا ہے۔ رتھ میں لال اور سرنگ گھوڑے جُتے ہوئے ہیں جو ہوا کے زور سے چلتے ہیں۔ وہ نذر و قربانی کا رتھبان ہے اور دیوتاؤں کو بلانے کے لئے اُن گھوڑوں کو جوتتا ہے۔ زمین پر اگنی کی پیدائش کے متعلق بھی بہت تذکرہ کیا گیا ہے۔ اکثر جگہ بیان کیا گیا ہے کہ دو لکڑیوں کو رگڑکر روزانہ آگ پیدا کی جاتی ہے۔ بنابران ایسی دو لکڑیاں اگنی کے والدین ظاہر کئے گئے ہیں اور اگنی کو "ابن القوتین" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے بایں معنی کہ لکڑیوں کے رگڑنے میں بہت طاقت صرف ہوتی ہے۔ وہ ایسا بچہ ہے کہ جب لکڑیوں سے پیدا ہوتا ہے تو مشکل سے گرفت میں آتا ہے۔ اگرچہ لکڑیاں خشک ہوتی ہیں لیکن یہ بچہ تر و تازہ پیدا ہوتا ہے اور پیدا ہوتے ہی والدین کو کھا جاتا ہے۔ دس کنواریاں اُس کو پیدا کرتی ہیں، یعنی دس اُنگلیاں جن سے کھڑی لکڑی کو برمے کی طرح پھراتے ہیں۔ چونکہ ہر گھر میں سویرے ہی سویرے نذر و قربانی کے لئے آگ روشن کی جاتی ہے اس لئے اگنی کی صفت یہ ہے کہ وہ علی الصباح بیدار ہونے والا دیوتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ جملہ دیوتاؤں کے درمیان عمر میں سب سے چھوٹا اور نوجوان دیوتا ہے۔ لیکن وہ قدیم بھی ہے کیونکہ سب سے پہلی قربانی اُسی نے کی ہے۔ اگنی کی تین پیدائشیں ہیں اور دیوتاؤں نے اُسے تین طرح کی خلقت عطا کی ہے۔ اُس کے رہنے کے بھی تین مقامات ہیں۔ "پہلے تو وہ آسمان سے پیدا ہوا۔ دوسری مرتبہ انسانوں میں اُس کی پیدائش ہوئی اور پھر پانی میں"۔ وہ آب ہائے فضائی سے ظاہر ہوتا ہے اور آسمان سے زمین پر آتا ہے۔ یہ سہ گانہ خلقت جس کی ابتدا رگوید کے ابتدائی بھجنوں سے ہوئی ہے آیندہ زمانے میں آفتاب و باد و آتش کی تثلیث ہر سہ عالم (آسمان و فضا و زمین) میں ساری و طاری قرار دی گئی اور رگوید کے بعد لیکن قدیم الدیام میں بھی آفتاب و اندر و آتش کی تثلیث قایم ہوئی جو آگے چلکر برہما اور وشنو اور شیو کی شکل میں

ہندو اقوام کے درمیان نمودار ہوئی اور جس کی بنا پر آج تک جو آگ نذر و نیاز کے لئے روشن کی جاتی ہے اُسکی نوعیت منجانب برہمنان تین طرح کی خیال کی جاتی ہے۔

روئے زمین پر آگ جگہ جگہ روشن ہوتی ہے اس لئے اگنی سیکڑوں ہزاروں مرتبہ روئے زمین پر پیدا ہوتا ہے اور وہ ہر خاندان و مکان میں رہتا ہے۔ لیکن ہے وہ ایک ہی۔ دنیا میں وہ ہر سمت متفرق طور پر پھیلا ہوا ہے، لیکن وہ بذاتہٖ ایک ہی بادشاہ ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ اگنی درخت ہے اور آتش ہائے متفرق اُس کی شاخیں ہیں۔ اُس کے بہت سے نام ہیں اور وہ متعدد و مختلف خداوندی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اُسمیں دوسرے تمام دیوتا اس طرح شامل ہیں جیسے پہیئے میں آرے۔ رگ وید کے بھجنوں میں صرف اگنی دیوتا ہی کی (ماسوائے آفتاب) یہ حمد و ثنا ہے جو وحدانیت کا رنگ اور ڈھنگ پیدا کرتی ہے۔

اگنی، ایک ایسی لافانی شخصیت ہے جس نے فانیوں میں رہنا قبول کیا۔ وہ انسانی گھروں میں مہمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور صرف یہی ایک دیوتا ہے جس کو 'گرہ پتی' یعنی صاحبِ خانہ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

چونکہ اگنی نذر و نیاز کی تکمیل کراتا ہے اس لئے اُس کا ذکر ایسے قاصد یا ایلچی کی حیثیت سے بھی کیا گیا ہے جو آسمان و زمین کے درمیان آتا جاتا ہے اور عبادت، نذر و نیاز اور دعاؤں وغیرہ کو آسمانوں یا دیوتاؤں تک پہونچا دیتا ہے اسی بنا پر وہ پجاری بھی ہے جو پوجا کراتا ہے۔ جس طرح اندر بہادری و دلیری میں جہان پہلوان ہے اُسی طرح 'اگنی' نذر و نیاز کا اُسقفِ اعظم ہے۔

سب سے بڑی صفت اگنی کی یہ ہے کہ وہ اپنے پوجنے والوں کے لئے نہایت رحمٰن و رحیم ہے۔ جو لوگ اُس کی پوجا یعنی نذر و نیاز کرتے ہیں ہر وقت اور ہر حالت میں وہ اُن کا نگراں رہتا ہے اور اُن کے دشمنوں کو خشک گھاس کی طرح جلا دیتا ہے اور بدخواہوں کو اس طرح نیست و نابود کر دیتا ہے جس طرح بجلی درخت کو برباد کر دیتی ہے۔ اُس کی ذات سے قسم قسم کی برکتیں اسطرح جاری ہیں جس طرح درخت سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ تمام خزائن عالم اُس میں جمع ہیں اور وہ مال و دولت کا دروازہ کھولدیتا ہے۔ وہ آسمان سے بارش لاتا ہے اور دشتِ ریگ میں چشمۂ شیریں کے مانند ہے۔ اگر اندر کے صفات کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو اگنی کے عطیات گھر کے امن و چین۔ اولاد۔ عام خوشحالی پر مشتمل ہیں اور اندر فتوحات۔ مالِ غنیمت۔ طاقت و قوت اور شان و شکوہ عطا کرتا ہے۔ اگنی کی ایک اور صفت بھی ہے اور وہ یہ کہ اگنی اپنی روشنی سے ارواح خبیثہ کو بھگا دیتا ہے۔ اس لئے اُس کا ایک لقب رکشوہن یعنی قاتل شیاطین بھی ہے۔ رگوید کے بھجنوں میں اور رگویدی زمانہ کے مراسم عبادت میں یہ صفت بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ اگنی کے بعد اہم ترین ارضی دیوتا سوم ہے۔ رگوید کا ایک پورا منڈل (نمبر ۹) اُس کی ثنا و صفت میں ہے اور دوسرے منڈلوں میں بھی جا بجا اس کا ذکر آیا ہے۔ اس کثرتِ بیان کے اعتبار سے اندر اور اگنی کے بعد سوم کا تیسرا نمبر ہے۔

آتش پرستی کے سلسلہ میں رگوید کے اہم مراسم عبادت میں سوم پرستی ایک اہم عبادت ہے۔ گائے وغیرہ کا چمڑا پھیلا کر اُس پر سوم کا پودا معہ ڈنڈی اور پتوں کے پتھر سے پیسا جاتا تھا اور بھیڑ کے بالوں کی چھلنی میں چھان کر لکڑی کے ظروف میں بھرا جاتا تھا۔ پھر زمین پر ایک خاص قسم کی گھاس کا فرش کر کے اُس پر سوم رس سے بھرے ہوئے ظروف دیوتاؤں کی نذر کے لئے رکھدئے جاتے تھے۔ اس عمل کا بیان رگوید میں طرح طرح کے مبالغہ آمیز طریقوں سے کیا گیا ہے نویں منڈل میں زیادہ حصہ ایسے بھجنوں کا ہے جو سوم کی طیاری کے وقت پیہم پڑھے یا گائے جاتے تھے۔

سوم کو دس دوشیزہ بہنیں یا دوشوت (طلوع ہونے والے آفتاب کی دس لڑکیاں) پاک و صاف کرتی ہیں۔ یعنی ہاتھوں کی دس اُنگلیاں۔ چمڑے پر سوم کا پیسا جانا ایسا ہے گویا پتھر اُس کو چبا چبا کر جگالی کر رہے ہیں۔ جب سوم رس بہتا ہے یا چھلنی میں چھنتا ہے تو وہ بھینسوں کی طرح ظروف چوبی کے جنگلوں کی طرف جھپٹ کر جاتا ہے۔ پرند کی طرح اُڑ کر پیالوں میں اپنا گھر بناتا ہے اور جس طرح کوئی چڑیا اپنا نشیمن درخت پر بناتی ہے اُسی طرح یہ ارغوانی مستی خم ہائے چوبی پر بیٹھتی ہے۔ جب سوم رس پانی میں ملایا جاتا ہے تو جیسے ڈکارتا ہوا بیل گایوں کے گلہ کی طرف دوڑتا ہے اُسی طور پر وہ پانی کی طرف لپکتا ہے۔ پانی اُس کی ماں ہے۔ جب پوجاری اُس میں دودھ ملاتے ہیں تو گویا سفید گائے کے لباس سے اُس کو ملبوس کر دیتے ہیں۔

سوم کی آواز کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ بالعموم اس سلسلہ میں اُس کی سانڈ سے تشبیہ دی گئی ہے اور جس پانی میں رس ملایا جاتا ہے اُسے گائے تصور کیا گیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے کہ جب سوم چھنتا ہے تو اُس وقت ایسی آواز نکلتی ہے جو غوغائے جنگ سے مشابہ ہے۔ کبھی اُس کی آواز چیخنے چنگھاڑنے کا رنگ دکھاتی ہے اور کبھی گرجنے اور ڈھاڑنے کی صورت اختیار کرتی ہے۔

اُس کے ارغوانی اور زرد رنگ کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ وہ متجلی ہے اور شعاعیں بھی پیدا کرتا ہے۔ اکثر اُس کو آفتاب سے مشابہ بیان کیا گیا ہے۔

اُس کی مفرح اور قوت بخش تاثیر کی وجہ سے اُس کو آبِ حیوان (امرت) قرار دیا گیا ہے۔ وہ عمرِ خضر عطا کرتا ہے اور دیوتاؤں کا شربت ہے۔ وہ اس قدر طاقت بخش ہے کہ دیوتاؤں کا شربت ہے۔ وہ اس قدر طاقت بخش ہے کہ دیوتاؤں کو بھی لافانی بنا دیتا ہے۔ اپنے پوجاری کو وہ ایسے ابدی وسعت رکھنے والے مقام پر پہونچا دیتا ہے جو عالم نور ضیا ہے اور جہاں شاہ یم رہتا ہے۔ لہذا سوم رس ہر بیماری کی دوا ہے اور ہر مریض کو شفا عنایت کرتا ہے یہاں تک کہ اندھے کو سوجھلا اور لنگڑے کو پاؤں والا کر دیتا ہے۔

(باقی)

ا۔ ح

استفسارات

ادب اور جنسی جذبات

(جناب محمد مثنیٰ صاحب - مسلم بورڈنگ ہوس الہ آباد)

جناب نیاز صاحب قبلہ - تسلیم و نیاز -

معاف کیجئے گا، آپ کو ایک زحمت دے رہا ہوں، آج کل ادبی حلقوں میں "جنس" کے بارے میں عجیب طرح کی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں میں سے کچھ تو اس خیال کے حامی ہیں کہ زندگی میں بدنظمی (maladjustment) کی وجہ سے جو جنسی گرہیں یا رکاوٹیں ( ) پڑ جاتی ہیں اُن کا ذکر کرنا یا اُن کی عکاسی بُری چیز نہیں، مگر اُن میں تلذذ کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ آل احمد سرور، سجاد ظہیر اور غالباً مجنوں اور احتشام کا بھی یہی خیال ہے مگر میں نے کچھ مضامین محمد حسن عسکری اڈیٹر ساقی کے پڑھے۔ ان میں انھوں نے بالکل نئی باتیں کہی ہیں، اُن کا خیال ہے کہ ہر وہ ادب پارہ جس میں جنسیت کا ذکر ہوگا، ترغیب اور لذت کا پہلو ضرور لئے ہوگا اور اگر ایسا نہیں تو وہ ادب کہلانے کا مستحق نہیں، لیکن لذت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس سے ہمارے جذبات میں سکون اور ارتفاع پیدا ہوتا ہے اور دوسری وہ جو جذباتیت کے بہاؤ سے پیدا ہوتی ہے اور جس سے ہم صرف ایک بار لطف اندوز ہو سکتے ہیں دوبارہ نہیں اور شاید ادب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عارضی اور ہنگامی اور وقتی جذبات سے دور ہی رہے اگر ایسا نہیں ہے تو وہ زندہ، جاندار اور صحت مند ادب نہ ہوگا یہ ہیں دو قسم کے خیالات - سمجھ میں نہیں آتا کہ "جنس" کے تذکرہ یا بیان سے ادیب کو کون سا افادی پہلو مل جاتا ہے اور اسکی عکاسی کرنے سے اُن کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ وہ کس قسم کا جنسی نظام چاہتے ہیں؟ کس قسم کا نظام زندگی قایم ہو جائے جس سے جنسی کاوٹیں دور ہو جائیں؟ یہ ہیں وہ سوالات جو اُن دونوں نظریوں سے میرے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، میں نے ان پر غور کیا ہے مگر تسکین کے لئے آپ سے پوچھ رہا ہوں - اس کا جواب چاہے مجھے براہ راست بھیجدیجئے یا نگار کی وساطت سے دیجئے۔ آپ کی خوشی اور رضی پر ہے -

---

(نگار) آپ کے سوالات بہت برمحل ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں جس نے ترقی پسند ادیبوں کے بعض مقالات اس باب میں مطالعہ کئے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات یا شبہات انھیں کے سامنے پیش کرنا چاہئے اور انھیں سے

اس کے جواب کا مطالبہ ہونا چاہئے کیونکہ ممکن ہے اس سلسلہ میں وہ کچھ اصولی باتیں بھی بیان کرسکیں اور اس طرح دوسروں کو بھی سوچنے اور سمجھنے کا موقعہ مل سکے۔ آپ کی طرح میں بھی بارہا غور کرچکا ہوں کہ "جنسی گرہوں" سے دراصل کس قسم کی "ناآسودگیاں" مراد ہیں اور ان سے ہماری سوشل زندگی کیوں اور کس حد تک متاثر ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ اگر جنسی جذبات کا اظہار ادب میں کافی آزادی و بیباکی کے ساتھ کیا جائے، تو اس سے ہماری زندگی کو کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے اور اس اظہار سے شائبۂ تلذذ دور ہوسکتا ہے یا نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس مسئلہ میں ترقی پسند ادیبوں کا کوئی واضح بیان اسوقت تک میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ میں ان کا صحیح نقطۂ نظر سمجھ سکوں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اس باب میں ان کا خدا یا ناخدا فرائڈ ہے لیکن فرائڈ کے نظریہ کا ہمارے ادب سے کیا تعلق ہے، یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

فرائڈ، آسٹریا کا ایک سائنس داں تھا اور اس کی تحقیقات زیادہ تر خوابوں کی حقیقت اور اعصابی امراض سے متعلق تھی، گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ تحلیل نفس (Psycho - analysis) کے ذریعہ سے اسنے ہسٹیریا وغیرہ بعض عصبی بیماریوں کے علاج پر غور کیا تھا اور اسی لئے وہ بعد کو اعصابی امراض کے معالج کی حیثیت سے ویانا یونیورسٹی میں پروفیسر بنا دیا گیا۔

اس نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھیں، جن میں

—— Delusion + dream

Totem + Taboo —— Three Contributions to Theory of Sex

خاص شہرت رکھتی ہیں —— اعصابی امراض کے متعلق اس کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہمارے نفس غیر شعوری کی بعض خواہشات تحت شعوری حالت میں پوری ہونے کے لئے بیتاب ہوتی ہیں تو ہسٹریا کے قسم کے اعصابی امراض پیدا ہوجاتے ہیں۔ اول تو یہی بات اب تک پوری طرح واضح نہیں ہوسکی کہ نفس غیر شعوری (Unconscious) —— سے کیا مراد ہے، اس کی خواہشات کیا معنی رکھتی ہیں اور تحت شعوری (Sub-Conscious) حالت میں ان کی تکمیل کے لئے بیتاب ہونا کیا —— ؟ کیونکہ یہ سب فرائڈ کے مفروضات ہیں اور "حقایق و مسلمات" کا مرتبہ انھیں حاصل نہیں، لیکن اگر ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے صحیح باور کرلیں، تو بھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ادب میں فرائڈ کے اصول پر کاربند ہوکر ہم اپنے اخلاقی نقایص کا علاج کیونکر کرسکتے ہیں، جبکہ طبی حیثیت سے بھی فرائڈ کے اصول اعصابی امراض کے علاج میں زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔

نفسیات میں غیر شعوری و تحت شعوری کیفیات یکسر وراثتی چیز ہیں، اور ان سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا علاج اگر ممکن ہے تو صرف اس طرح کہ ہم قوت ضبط سے ان کا مقابلہ کریں اور اس تعقل و تفکر سے کام لیں جو انسان کو دوسرے حیوانات سے جدا کرتی ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص جنسی جذبات کے لحاظ سے بہت بے قابو ہے اور وہ اس خواہش کی تسکین میں اصول اخلاق

سے تجاوز کر جاتا ہے، تو فرائڈ کے نظریہ کے لحاظ سے جیسا کہ ہمارے بعض ترقی پسند ادیب سمجھتے ہیں، اس کا علاج یہ ہونا چاہیئے کہ اس کو ان جذبات کی تسکین کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ اس کی اولاد کی غیر شعوری کیفیت اس جذبہ سے خالی رہے اور تحت شعوری حالت اس سے متاثر نہ ہو۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ طریق کار بجائے مفید ہونے کے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوگا، کیونکہ نفسیات کا تعلق وراثت سے ہے اور اگر ایک شخص جذبات جنسی کی تسکین کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے گا تو یقیناً اس کی اولاد میں بھی یہ نفسیاتی کیفیت منتقل ہوگی اور یہ جذبہ بجائے معتدل ہونے کے اور زیادہ قوی ہوتا جائے گا۔ یہ تو ممکن ہے کہ اگر کسی خاص جذبہ کی عدم تسکین کی وجہ سے کوئی شخص کسی عصبی مرض میں مبتلا ہوگیا ہے تو انفرادی حیثیت سے اس جذبہ کی تسکین تخفیف مرض میں معاون ہو لیکن یہ کہنا کہ اس طرح اس کی اولاد بھی ہمیشہ اس عصبی مرض سے پاک رہے گی، کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ علاوہ بریں اگر اس اصول کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تسکین جذبات سے ہمارے وہ جذبات بھی جن کا معتدل حالت میں پایا جانا ضروری ہے، رفتہ رفتہ ختم ہوسکتے ہیں اور یہ کوئی مفید بات نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انسان میں بہت سی حیوانی خصوصیات پائی جاتی ہیں، بعض میں اعتدال کے ساتھ، بعض میں ضرورت سے زیادہ۔ اس لئے بہیئت اجتماعی کا نظام اس کا مقتضی تو ضرور ہے کہ جذبات کی بے اعتدالی ختم ہو، لیکن ان کا یکسر فقدان نہ ممکن ہے نہ ہمارا تمدن اس کی اجازت دے سکتا ہے۔ اس لئے موضوع زیر بحث کے لحاظ سے سب سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ جنسی جذبات کی عکاسی یا ان کا اظہار کیا معنی رکھتا ہے، اگر اس سے مقصود خالص علمی حیثیت سے جنسیات (sexology) پر گفتگو کرنا ہے، تو اس کے افادہ سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن ادب سے اسکو کوئی تعلق نہیں، اور اگر مدعا یہ ہے کہ افسانوں اور نظموں میں بھی پوری آزادی و بیباکی سے ان جذبات کا اظہار کیا جائے تو یہ نہ کوئی علمی خدمت ہوگی، نہ اخلاقی اور شاید ادبی بھی نہیں، کیونکہ ادبیات میں عشقیہ شاعری یا غزل ہی وہ چیز ہے جس میں جنسی جذبات کے اظہار کا موقع ہے، لیکن یہاں بھی اسکے برملا اظہار کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔

بہرحال یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جنسی گرہوں کے اظہار سے ان حضرات کی کیا مراد ہے اور اس اظہار کی کس صورت کو وہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ جنسی جذبات کا اظہار کیا جائے اور اس میں شائبۂ تلذذ نہ ہو، ناممکن ہے کیونکہ جنسیات کی وہ کتابیں بھی جو بالکل علمی حیثیت رکھتی ہیں، تلذذ کی کیفیت سے خالی نہیں ہوتیں، چہ جائیکہ ادب لطیف کے پیرایہ میں اس کا ذکر کہ وہ تو براہ راست ہمارے جذبات سے اپیل کرنے والی چیز ہے، گو وہ وقتی و ہنگامی ہی کیوں نہیں لیکن اگر وقتی و ہنگامی چیز ہی کو مختلف پہلوؤں سے بار بار پیش کیا جائے گا تو اس کا اثر بھی دیرپا ہوگا اور اگر یہ اثر نظام تمدن کے لئے مفید نہیں تو پھر تلذذ یا عدم تلذذ کی بحث ہی بیکار ہے، اور اس نوع کے لٹریچر کو بہرنوع ختم ہونا چاہیئے۔

مالہ وماعلیہ

جگر، فراق اور جوش

ہمایوں کے جوبلی نمبر میں، دو مشہور شاعروں کی دو غزلیں شایع ہوئی ہیں، ایک حضرت جگر مراد آبادی کی اور دوسری جناب فراق گورکھپوری کی اور دونوں ان حضرات کی شہرت کے لحاظ سے گری ہوئی ہیں۔ جگر مراد آبادی کی غزل چونکہ حال ہی کی فکر ہے، اس لئے اسے تو خیر پست ہونا ہی چاہئے، کیونکہ جوانی کے ختم ہونے پر جو چیز اُن کے کلام میں کیف و رنگ پیدا کر دیتی تھی، وہ اب ترک ہو چکی ہے اور اسی لئے ان کا زمانۂ حال کا کلام یکسر بے آب و رنگ ہے، لیکن فراق نے کیوں اپنا رنگ چھوڑ کر بیدل کی بحر و طرز میں، فکر کی، البتہ حیرت انگیز ہے۔ پہلے جگر کی غزل ملاحظہ ہو:

کس کا خیال ہے دلِ مضطر لئے ہوئے
آنسو ہیں رنگ و بوئے گلِ تر لئے ہوئے

آئی ہے موت حسن کا منظر لئے ہوئے
لیکن غمِ حیات مکرر لئے ہوئے

ہر لحظہ اک سرور میسّر لئے ہوئے
خود زندگی ہے بادہ و ساغر لئے ہوئے

یادش بخیر پھر ہے اُسی رہ گزر کی یاد
گزرے تھے ہم جہاں سے کبھی سر لئے ہوئے

کونین کی ہوس میں ہے انساں ذلیل و خوار
کونین اپنے سینے کے اندر لئے ہوئے

دنیا بھی کیا مقام ہے جس میں کہ بارہا
ہنسنا پڑا ہے قلبِ مکدّر لئے ہوئے

اللہ رے بے بسی کہ غمِ روزگار بھی
بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لئے ہوئے

شرمِ گنہ سے بڑھ کے ہے عفوِ گنہ کی شرم
یارب کہاں میں جاؤں یہ نشتر لئے ہوئے

عصیاں کا بار ہٹ تو سکا سر سے اے کریم
لیکن ہوں ایک بوجھ سا دل پر لئے ہوئے

یارب کہاں گیا وہ زمانہ کہ عشق میں
اک دل تھے ہم بھی دل کے برابر لئے ہوئے

ہشیار اے نگاہِ ستم آشنائے دوست!
دل بھی ہے اک لطیف سا نشتر لئے ہوئے

اُف رے تجلّیِ رُخِ ساقی کہ بادہ کش
رہ رہ گئے ہیں، ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر
چھپرا کی قتل گاہ کا منظر لئے ہوئے!

پہلا مطلع غنیمت ہے، دوسرے مطلع میں معنوی نقص یہ ہے کہ جب موت، حیات مکرر کا غم بھی لئے ہوئے آتی ہے، تو وہ کونسا منظرِ حسن ہے جو اس کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ موت بُری نہیں اگر اسکے ساتھ حیاتِ مکرر کا غم شامل نہ ہو، لیکن مطلع بنانے کی کوشش میں یہ مفہوم خوبی سے ادا نہ ہوسکا۔

تیسرے مطلع میں لفظ میسّر کا استعمال درست نہیں اگر یہ "لئے ہوئے" سے متعلق ہے۔ تو میسّر لینا کوئی محاورہ نہیں اور اگر سرور کی صفت ہے تو سرورِ میسّر کے معنی سرورِ حاصلہ کے ہوں گے اور لئے ہوئے کے ساتھ وہ بالکل بیکار ہے، عربی میں میسّر، ذو یسار اور غنی کے معنے میں آتا ہے، لیکن اُردو میں اس کا استعمال ہمیشہ حاصل شدہ کے مفہوم میں کیا جاتا ہے۔

چوتھے شعر کا دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے۔ "سر لئے ہوئے گزرنا" نہ محاورہ ہے اور نہ کوئی نئی بات ہر شخص جہاں جاتا ہے سر لئے ہوئے جاتا ہے اور اب جو شاعر کو اس رہگزر کی یاد آئی ہے تو کیا بے سر لئے ہوئے جانے کا ارادہ ہے۔ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ جہاں سے ہم کبھی ہتھیلی پر سر لئے ہوئے گزرے تھے، اب پھر وہیں اسی رہگزر کی یاد آئی ہے۔

پانچواں شعر یکسر خارج از تغزل ہے۔ چھٹے شعر کے پہلے مصرعہ میں کہ غیر ضروری ہے اور بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی صحیح جگہ جس میں کے بعد نہیں بلکہ پہلے ہے، دوسرے مصرعہ میں قلب مکدر ثقیل ہے، اس کی جگہ دل کو مکدر کہہ سکتے تھے۔

ساتویں شعر میں کوئی رنگ تغزل نہیں پایا جاتا۔ آٹھواں اور نواں شعر قطعہ بند ہے اور متعدد نقایص رکھتا ہے عفو گنہ کی شرم پہلے شعر میں نشتر سے تعبیر کی گئی ہے، لیکن دوسرے شعر میں دل کے بوجھ سے اور دونوں کا عدم توافق ظاہر ہے۔ نویں شعر میں ہٹ تو سکا کی جگہ ہٹ تو گیا ہونا چاہیئے۔

دسویں شعر کا دوسرا مصرعہ مہمل ہے۔ دل کے برابر دوسرا وہ کونسا دل تھا جسے شاعر لئے ہوئے تھا اور ان دونوں دلوں میں کیا تفریق تھی۔

گیارھویں شعر کے دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان محل نظر ہے۔ دل کا نشتر لئے ہوئے ہوتا، بظاہر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس میں نشتر چُبھا ہوا ہے، نہ یہ کہ وہ خود کوئی نشتر چبھونے کے لئے رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس مفہوم کو بھی تسلیم کرلیں تو پہلے مصرعہ کا اقتضاء یہ تھا کہ بجائے دل کے کسی کیفیت کا اظہار کیا جاتا ——— دوست کی "نگاہِ ستم آشنا" کو اگر کوئی چیز چونکا سکتی ہے تو وہ کوئی کیفیت ہی ہوسکتی ہے، نہ کہ محض دل اگر یوں کہا جاتا کہ "ہماری خوئے وفا بھی اک نشتر لئے ہوئے ہے" تو البتہ نگاہ ستم آشنا کے مقابلہ میں درست ہوسکتا تھا۔

بارھواں شعر اچھا ہے اور مقطع بہت معمولی۔

فراق گورکھپوری کی غزل ملاحظہ ہو:-

جسے لوگ بتاتے ہیں زیرِ زمیں جسے کہتے ہیں عرشِ بریں پر ہے
مختار سے ہم مجبور ہوئے، یہ نکتہ مگر کیوں بھول گئے
کچھ اور ہی تیور رکھتی ہے ہم خاکیوں کی بل کھائی جبیں
ٹھہر اٹھہرا سا دورِ فلک، آثار زمانہ کیا کہئے
اسرارِ جہاں میں اے ناداں شک اور ایماں کو دخل نہیں
اک غم ہی سے آزاد نہیں وہ عشق سے جن کو کام نہیں
یہ اور ہی شعلہ ہے ناداں کیا برقِ طور کیا شمعِ حرم
سرمایہ داروں کا بوجھ بھی ہے مزدور کے دکھتے شانوں پر
انسان کی اور ایسی ذلت اے مذہب تجھ پہ خدا کی سنوار
سرگرمِ سفر ہے بھری دُنیا گردش میں زماں گردش میں مکاں
وہ تڑپ جسے جانِ سکوں کہئے وہ سکوں جو تڑپ ہو سر تا سر

وہ جہنم بھی دنیا ہی میں ہے وہ جنت بھی تو زمیں پر ہے
ہر مجبوری کو مختاری کر دینا بھی تو ہمیں پر ہے،
جو عالم قدسیوں پر بھی نہیں وہ آدم خاک نشیں پر ہے
جو اُلٹ دے تختۂ ہستی کو وہ شکن بھی فضا کی جبیں پر ہے
موقوف حقیقت دنیا کی نہ گماں پر ہے نہ یقیں پر ہے
کہ عذابِ نشاط و مسرت بھی عاشق کی جانِ حزیں پر ہے
جو صبحِ ازل کو بھی نہ ملی وہ جھلک انساں کی جبیں پر ہے
ان جیتے مُردوں کو کاندھا دینے کی بھی بیگار انھیں پر ہے
اس مظہرِ رازِ حقیقت کی بھی نجات ایمان اور دین پر ہے!
صد شامِ غریباں کا عالم ہر گام ہم اہلِ زمیں پر ہے
یہ تمام ہے مجھ سے عاشق پر اور ختم وہ تجھ سے حسیں پر ہے

بجز اسکے فراق زمانے کو کچھ عشق نے اپنا پتہ نہ دیا
ہوں انکے دلوں کی پرچھائیں، پرچھائیں جنکی زمیں پر ہے

فراق چونکہ فن شعر سے کم واقف ہیں، اس لئے وہ متداول بحروں کے علاوہ جب کسی اور بحر میں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی کوئی غزل کہتے ہیں تو اکثر اشعار خارج از تقطیع کہہ جاتے ہیں، یہ غزل جس بحر میں کہی گئی ہے وہ مشکل بحر ہے اور زحافات کی کافی رعایتوں کے بعد بھی اس میں کہنا آسان نہیں اس لئے اس کے اکثر مصرعے ناموزوں ہیں اور لفظوں کو دبا کر پڑھنے کے بعد بھی تقطیع سے خارج رہتے ہیں، لیکن اس سے قطع نظر جب ہم محض تغزل کی حیثیت سے اس کو دیکھتے ہیں، تو بھی حیرت ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ فراق اس غزل کے لکھتے وقت دماغ کی کن اُلجھنوں میں مبتلا تھے اور ایسی ناشگفتہ حالت میں انھوں نے کیوں غزل کہی۔

اگر ہم اسے مان لیں کہ غزل غیر عاشقانہ بھی ہوتی ہے، اور اس میں فلسفہ و اخلاق کے نکات بھی بیان کئے جا سکتے ہیں، تو بھی اس میں کوئی ایسی بات نہیں ——— پوری غزل غیر حاضر طبیعت کا نتیجہ ہے اور اسی لئے تصنع و آورد سے خالی نہیں۔

یوں تو فراق کی شاعری میں ابہام ہر جگہ پایا جاتا ہے، لیکن اس غزل کے "ابہامات" نقص بیان کی وجہ سے جس کی ذمہ دار زیادہ تر بحر کی دشواری ہے، اہمالات میں تبدیل ہو گئے ہیں اور فقرے کے فقرے مقصود و مفہوم کے لحاظ سے غلط

نظم ہوئے ہیں۔

اس غزل پر زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس کے نقایص بہت نمایاں ہیں۔ امید ہے کہ اپنے آیندہ مجموعۂ کلام میں وہ اس غزل کو شامل نہ کریں گے۔

ہمایوں کے اسی نمبر میں جوش ملیح آبادی کی بھی چھ رباعیاں شایع ہوئی ہیں۔ جن میں پہلی پانچ رباعیاں بہت پاکیزہ ہیں :۔

اچھی نہیں اے ندیم اتنی تعجیل، نارِ نمرود میں ہے گلزارِ خلیل
ہو جائیں گی جب فشردہ لاکھوں راتیں تب ٹپکے گا نیم قطرۂ صبحِ جمیل

غاروں کو جو ذرّاتِ عمل سے پاٹے وہ صاحبِ اوج، خاک کیونکر چاٹے
قدرت کا ازل سے ہے یہ حکمِ ناطق جو شخص پسینہ بوئے، دریا کاٹے

بڑھتا ہوں کبھی، کبھی ٹھہر جاتا ہوں جیتا ہوں کبھی، اور کبھی مرجاتا ہوں
گر پڑتا ہوں ذرّات سے ٹھوکر کھاکر اور گاہ پہاڑوں سے گزر جاتا ہوں

جب تک کہ یہ آسمان تھا مرکزِ دید غائب تاروں سے تھی فقط گفت و شنید
سمجھا ہوں زمین، جب سے مفہوم ترا ذرّوں سے اُگا رہا ہوں لاکھوں خورشید

ہر سانس میں کیا ٹیس ہے، اللہ غنی، سینے میں کھٹک رہی ہے ہیرے کی کنی
مابینِ کشاکشِ یقین و تشکیک اللہ ری خیالات کی اعضا شکنی

لیکن چھٹی رباعی کو بالکل نظری قرار دینا چاہیئے :۔

میں دیکھ سکوں، اور یہ تماشا تا دیر ! پردے کو گرا جلد کہ دل ہو گیا سیر
لیلائے تخیل کی انگوٹھی سے بھی کم، اے بارِ خدا ! یہی ہے آفاق کا گھیر؟

پہلے مصرعہ میں یہ خیال ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کائنات کا یہ تماشا میں تا دیر نہیں دیکھ سکتا، جلدی پردہ گرا کہ دل سیر ہو گیا ہے ——— لیکن پہلے مصرعہ کا انداز بیان اُلجھ کر رہ گیا۔ اور دب کر آر ہو جاتا ہے۔ جو اچھا نہیں معلوم ہوتا، یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا۔ کیا دیکھ سکوں گا یہ تماشہ تا دیر؟

رباعی کا دوسرا شعر بہت بھدا ہے۔ اول تو آفاق کا گھیر ہی ذوق پر گراں ہے کیونکہ گھیر کا مفہوم وسعت کے مفہوم سے بالکل علٰحدہ ہے۔ چہ جائیکہ اس کو لیلائے تخیل کی انگوٹھی سے منسوب کرنا جو سخت ناگوار تصنع و تکلف ہے۔

حرم و دیر

خدا رکھے جمالِ عارضِ تاباں کی زیبائی
تجلّی کونسی تھی جو مرے دل میں نہیں آئی
یہ تیری باوفائی اور یہ تیری پذیرائی
ادا کر ہی دیا تو نے مرا حقِ ثنا سائی
نہ تو اندر حرم گنجی، نہ در بتخانہ می آئی
ولیکن سوئے مشتاقاں، چہ مشتاقانہ می آئی
(اقبالؔ)

تری محفل ہے اس میں شوق سے آ "جانِ صد خوباں"
یہ دل ہے اور مرا دل ہے، تجھے کیوں فکر ہو لے جاں!
کہاں کی یہ فضائیں اور کیسا عالمِ امکاں
تری آہٹ سے اکثر خود تڑپ اُٹھا غمِ پنہاں
قدم بیباک تر نہ در حریمِ جانِ مشتاقاں،
تو صاحب خانۂ آخر چرا دزدانہ می آئی
(اقبالؔ)

محبت کی کرے گا تو کہاں تک آبرو ریزی؟
تری فطرت ہی شاید ہے فقط نیرنگی و تیزی
کبھی الطافِ رومی ہیں کبھی اندازِ تبریزی
کبھی یہ قہرمانی اُف کبھی یہ تیری چنگیزی
گہے صد لشکر انگیزی کہ "خونِ دوستاں" ریزی
گہے در انجمن با شیشہ و پیمانہ می آئی
(اقبالؔ)

کبھی شکلِ کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی
کبھی "موجِ شمیمے" بے محابا شعلہ می ریزی
بصد لطفِ عمیمے بے محابا شعلہ می ریزی
کبھی اندر گلیمے بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر "نخلِ کلیمے" بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر "شمعِ تمیمے" صورتِ پروانہ می آئی
(اقبالؔ)

عجم کا ذکر کیا ہے؟ تجھ سے دنیائے عرب میکش
عجب ساقی ہے اے اخترؔ! کہ سب حسبِ الطلب میکش
ترے افکارِ عالی بادہ اور سارا ادب میکش
مجازی مئے کی پیاسی تو خدارا کھے محب میکش
بیا اقبالؔ جامے از خمستانِ خودی درکش!
تو از "میخانۂ مغرب" نہ خود بیگانہ می آئی

سیدہ اخترؔ

نوائے جبریل :

(ماہر القادری)

دل کی دھڑکن سے پیالوں کھنک دب جائیگی
عیش کا افسانہ دُنیا اب نہیں دُہرائے گی

چنگ و بربط اب نہ بننے پائینگے فردوسِ گوش
قلقلِ مینا بھی سُرمہ در گلو ہو جائے گی

تیغ کی جھنکار پر جھومے گی روحِ بادہ خوار
چشمِ ساقی اب کسی کو بھی نہیں بہکائے گی

لالۂ خونیں کفن دے گا پیامِ زندگی،
جب کبھی گلشن پہ ساون کی گھٹا لہرائے گی

خاک کے ذرّے بھی ڈالیں گے ستاروں پر کمند
پھول کی پتّی شفق کو آئینہ دکھلائے گی

کھل گیا اہلِ چمن پر نرمیِ گُل کا فریب
بُلبلِ خوش رنگ اب کانٹوں سے جی بہلائے گی

کوئی بھی اُسکو نہیں دیگا سہارا دیکھنا!
موجِ بوئے گل اگر چلتے میں ٹھوکر کھائے گی

صرف اک "اللہ" پر ہوگا ہر اک کا اعتماد
فطرتِ انساں نہ خوفِ غیر سے گھبرائے گی

کلام نسریں :

زباں ابھی سے کہے داستانِ اُلفت کیوں
ابھی نگاہ میں تابِ کلام باقی ہے

دیکھئے اب نہ یاد آئے آپ
آجکل آپ سے خفا ہوں میں

اک انوکھی سی بات ہے اے دوست
کیسے مانوں کہ تم نے یاد کیا!

میں نے بیتاب ہو کے ہاتھ بڑھائے
اس نے بیتاب ہو کے چوم لئے،

موسم کی خنک ہوائیں، توبہ،
جذبات پہ کپکپی ہے طاری

وہ آخر شب کسی کی آمد،
تارے بھی فلک پہ سو گئے تھے

نفسِ اعتبار

دھوپ کی شدت سے پگھلی جا رہی تھی کائنات
تلملا اُٹھی تھی سطحِ خاک پر موجِ حیات

لو کی لپٹیں کھیلتی تھیں موجۂ انفاس سے
جھل رہی تھی اگنی دیوی گرم پنکھا پاس سے

آتشیں چشمے اُبل آئے تھے سطحِ خاک سے
شعلے اُٹھتے تھے زمیں کے روئے آتشناک سے

تھیں جہنم کی ادائیں اک طرف گرمِ عمل،
اک طرف مجبور انساں سربکف، گرمِ عمل،

ہل چلائے جا رہا تھا ایک دیہاتی کسان
گیت گائے جا رہا تھا ایک دیہاتی کسان

جب خیالوں میں عمل گرم و ستیزہ کار ہو
عام ذہنیت میں جب روحِ عمل بیدار ہو،

جب بجائے خوں رگوں میں دورِ آتشناک ہو
فکرِ بالیدہ میں پیدا جرأتِ بیباک ہو،

شدتِ احساس جب یوں جلوہ ارزانی کرے
آگ پیدا کیوں نہ اندازِ گلستانی کرے

مسکرا اے زندگی تیرِ قضا کے سامنے
بڑھ رہا ہے پھر یقیں بازو اجل کے تھامنے

شمیم نعمانی

غزل : حُرمت الاکرام

داستانِ غمِ دل تجھ کو سناتا اے دوست !
ہو سکا مجھ سے تو یہ بھی نہ گوارا اے دوست !

غمِ دنیا کا نہیں کوئی کنارہ لیکن،
پھر بھی ممکن نہیں دنیا سے کنارا اے دوست!

میری سیرت کے خط و خال نظر کیا آتے،
مجھ کو دنیا نے بہت دور سے دیکھا اے دوست!

دوسرے مجھ کو نہ سمجھے تو کوئی بات نہ تھی
شکوہ یہ ہے کہ مجھے تو بھی نہ سمجھا اے دوست!

مجھ سے ہر بار مسرت نے چھڑایا دامن،
مجھ کو سو بار دیا غم نے سہارا اے دوست!

بیاضِ نیاز

(حالی)

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرمان ہے حمد سرا تیرا

رونا نہ ہوگا حالی شاید یہ کم تمہارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا

اسی میں ہے خیر حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد۔ اسکی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجئے گا

مُنہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جائیں کہ ہیں
اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

ہم روزِ وداع اُس سے ہنس ہنس کہ ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحبِ دل ہوتے سُن کر مری بیتابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

جو جان سے درگزرے وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانئے کیا ہوتا

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کچھ میری بیخودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جانتا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چُبھ گئی
مانا کہ اُس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

عمر شاید نہ کرے آج وفا،
کانٹا ہے شبِ تنہائی کا

اغماض چلتے وقت مروّت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رُلاتا ضرور تھا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اُس کا خطا ہوگیا

اک خوسی ہوگئی ہے تحمّل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا،

آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا،،

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبط راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل،
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرانی ہے بہت آج بھنور کی صورت

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یہاں سزا کے بعد

گو مے ہے تُند و تلخ - پہ ساقی ہے دل رُبا — اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر

ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا — اُس نے نقاب رُخ سے ہٹایا نہیں ہنوز

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں — فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

دل سے خوشیاں ہوگئیں سب گوشہ گیر — نام تھا شاید جوانی کا نشاط

غنچہ چٹکا اور آپہونچی خزاں — فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں، — آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

ہنستے ہیں اُس کے گریۂ بے اختیار پر — بھولے ہیں بات کہکے کوئی رازداں سے ہم

خوابِ راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں — جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

بہت جی خوش ہوا حالی سے ملکر — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اُس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف — ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

وفا اغیار کی اغیار سے سُن — مری اُلفت در و دیوار سے پوچھ

فریبِ وعدۂ دلدار کی قدر — شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

ملے گا نہ گلچیں کو گُل کا پتا — ہر اک پنکھڑی پوں بکھر جائے گی

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں — وہ اگر ہمت آزمانے لگے

تم کو کرنا پڑے گا عذرِ جفا — ہم اگر دردِ دل سُنانے لگے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چُرانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر — ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت — ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

طبعِ انساں کو دی سرشتِ وفا — خاک کو کیمیا کیا تو نے

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب — کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالی اُٹھا ہلا کے محفل کو — آخر اپنا کہا کیا تو نے

مطبوعات موصولہ

سیاسی نظرئے ترجمہ ہے لندن یونیورسٹی کے پروفیسر میر تشا کی کتاب کا جو اس نے افکار سیاست کے ارتقاء پر لکھی تھی۔ اس مختصر سی کتاب میں فاضل مصنف نے ابتداء عہد یونان سے لیکر بیسویں صدی عیسوی تک کی سیاسی تاریخ کو نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور فاضل مترجم ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ام، اے، پی، ایچ، ڈی نے آخری باب کا خود اپنی طرف سے اضافہ کر کے کتاب کو اور زیادہ مکمل کر دیا ہے۔ ترجمہ نہایت صاف وسلیس ہے۔ ضخامت ۹۳ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ کتابت وطباعت نہایت نفیس۔ ملنے کا پتہ: حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

افادی ادب مقالہ ہے جناب اختر انصاری کا جس میں انھوں نے رومانی ادب اور افادی ادب کے نہج و مقصد سے بحث کی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک انتقادی تبصرہ ہے قدیم وجدید ادب پر، جس میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ نہ قدیم ادب کے محاسن کو اس لئے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ وہ "ادب برائے زندگی" کی چیز نہیں، اور نہ جدید ادب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ادب کے رومانی محاسن کو خیرباد کہدے۔

جناب اختر انصاری بہت سلجھا ہوا دماغ رکھتے ہیں اور ان کی تمام تصانیف سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ حجم ۱۰۳ صفحات، طباعت وکتابت نہایت پاکیزہ، قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظرئے آخری دور کے علماء میں، شاہ ولی اللہ پہلے شخص تھے، جنھوں نے مذہب کو ہیئت اجتماعی کے نقطۂ نظر سے پیش کیا اور بہت سے ان مفروضات و مزعومات کی تردید کر دی جن کو مذہب کا جزو تسلیم کیا جاتا تھا۔ شاہ صاحب اب سے ڈھائی سو سال قبل پائے جاتے تھے لیکن ان کے اکثر ارشادات آج بھی ہمارے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ شمس الرحمان صاحب محسنی بی، اے عرصہ سے شاہ صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے، اور ساتھ ساتھ یادداشت مرتب کرتے جاتے تھے اور یہ تصنیف انھیں یادداشتوں کا مجموعہ ہے جس میں عمرانیت ومعاشرہ کے تمام وہ ضروری مسایل جن کا تعلق مذہب، نفسیات اور اخلاق سے

ہوسکتا ہے، یکجا کردئے گئے ہیں۔

آج دُنیا امن وسکون کے لئے بیتاب ہے اور موجودہ نظام سیاست وتمدن نوع انسانی کی نجات کے لئے کوئی موثر طریقہ پیش نہیں کرسکتا، لیکن کیوں؟ اس کا جواب شاہ ولی اللہ صاحب اب سے ڈھائی صدی قبل دیچکے تھے، جس کو مختلف پہلوؤں سے اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے۔

محسنی صاحب کی یہ کوشش بڑی برمحل کوشش ہے اور ضرورت ہے کہ ہر شخص اس سے استفادہ کرے۔ قیمت عہ۱۲ ملنے کا پتہ: سندھ ساگر اکاڈیمی لاہور۔

تعلیم اور سماج اس وقت بچّوں کی تعلیم سے زیادہ اہم مسئلہ اُستادوں کی تعلیم کا ہے، کیونکہ صحیح تعلیم وتربیت کی ساری ذمہ داری طلبہ پر نہیں بلکہ اساتذہ پر عاید ہوتی ہے۔

اس وقت ہر شخص اپنی جگہ محسوس کر رہا ہے کہ ہندوستان کے جامعات وکلیات کا طریق تعلیم حد درجہ ناقص ہے اور یہاں کے طلبہ علم واخلاق دونوں حیثیتوں سے بالکل نکمے ثابت ہوتے ہیں۔

جناب سعید انصاری بی اے نے خود امریکہ جاکر وہاں کی دیہی تعلیم کا مطالعہ کیا اور نتائج مطالعہ کو اس کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ کتاب نہایت مفید ودلچسپ ہے حجم ۱۴۲ صفحات۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ۔ قرول باغ دہلی۔

ذاکر صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا مطالعہ ہے، پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے قلم سے اور انھیں تمام خصوصیات کے ساتھ جو رشید صاحب کا حصّہ ہیں۔ ذاکر صاحب اور رشید صاحب دونوں کا دوران تعلیم میں ساتھ رہا ہے اور انھوں نے ایسے دو دوستوں کی سی زندگی علیگڈھ میں گزاری ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بغیر کچھ کہے ہوئے ختم ہوجائے، تو دوسرے کی صحیح فطرت وزندگی کا علم کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

رشید صاحب نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اسے نہ ذاکر صاحب کے سوانح حیات کہا جاسکتا ہے اور نہ ان کے علمی کارناموں کی تفصیل، لیکن اس تفریحی وسرسری مطالعہ میں بھی وہ رموز پنہاں ہیں، کہ ان کے جانے بغیر، کوئی شخص ذاکر صاحب کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ قیمت عہ۸۔ ملنے کا پتہ: کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی۔

بات چیت صالحہ عابد حسین کی تیرہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے جو ۳۶ء سے ۴۵ء تک دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے عورتوں کے پروگرام میں وقتاً فوقتاً نشر کی گئی تھیں۔ اس مجموعہ میں بعض تقریریں وہ ہیں جو خود فاضل مقررہ یا اُن کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض باہر کی دُنیا سے اور دونوں قسموں کی تقریریں اپنے موضوع، اندازِ بیان اور افادیت کے لحاظ سے قابل مطالعہ ہیں۔

صالحہ عابد حسین حالی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک بڑے فاضل بھائی کی بہن اور بڑے قابل شوہر کی

بیوی ہیں۔ اس لئے ان کا ماضی وحال دونوں علمی ماحول میں بسر ہوا ہے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس ماحول سے انھوں نے پورا فایدہ اُٹھایا۔

یہ کتاب نہ صرف عورتوں اور بچّوں بلکہ اچھے پڑھے لکھے مردوں کے لئے بھی مفید ہے اس لئے امید ہے کہ اسے عام مقبولیت حاصل ہوگی۔ قیمت عہ/۱۲ - ملنے کا پتہ : کتابی دُنیا لمٹیڈ دہلی۔

روس انقلاب کے بعد یہ کتاب محمد مسعود جوہر کی تصنیف ہے جس میں ۱۹۴۵ء سے لیکر عہد حاضر تک روس کی سیاسی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سے قبل وہ ایک اور کتاب "انقلاب روس" لکھ چکے ہیں جس میں روسی اشتراکیت کا حال ۲۴ء تک کا درج تھا۔ اس لئے اس کتاب کو اسی کا دوسرا حصّہ سمجھنا چاہئے۔ جوہر صاحب نے اس کتاب میں ٹراٹسکی اور لینن کے نظریوں پر بحث کرکے دونوں کے فرق و امتیاز کو نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا ہے۔ اور دوسری جنگ عظیم میں جو حصّہ روس نے لیا ہے اسکی تاریخ بھی پورے بسط کے ساتھ پیش کی ہے۔ کتاب حکومت روس سے متعلق تمام ضروری مباحث پر مشتمل ہے اور بیش بہا معلومات کی حامل ہے۔ حجم ۲۱۶ صفحات قیمت ۸ر - ملنے کا پتہ : سندھ ساگر اکاڈیمی۔ لاہور۔

اسلامی سیاست مجموعہ ہے ابوالسلام نعیم صدیقی کے متعدد مقالات کا جس میں انھوں نے اسلامی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے جسکی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ان مقالات کا انداز خطیبانہ ہے اور ایک حد تک طفلانہ بھی، کیونکہ ان مسایل میں جس سنجیدگی ومتانت جس تحقیق ونظر اور جس انداز بیان کی ضرورت ہے، اس سے یہ مقالات بڑی حد تک خالی ہیں، اور ہم ان کے مطالعہ کے بعد کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتے۔

حجم ۱۷۶ صفحات قیمت عہ/۱۴ - ملنے کا پتہ : مکتبۂ نشاۃ ثانیہ، چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد دکن۔

میثاق الانبیاء تصنیف ہے ابوالکلام غازی محمد عبدالغنی مبلغ اسلام حیدرآباد دکن کی اور تمام اُن خصوصیات کی حامل ہے جو موجودہ زمانہ میں ایک مبلغ کی تصنیف میں ہونا چاہئے، خواہ وہ پیشہ ور مبلغ ہو یا غیر پیشہ ور۔

یہ کتاب ان لوگوں کے لئے بہت کارآمد ہے جو عوام میں اسلام پر لکچر دیتے رہتے ہیں۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ :- دیندار انجمن آصف نگر، خانقاہ سرور عالم حیدرآباد دکن۔

دنیا میں جنم انگریزی میں Curtain Raisers بڑی مشہور کتاب ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ بعض سخت گیر یا محتاط بیویاں کیونکر اپنے شوہر سے محاسبہ کیا کرتی ہیں اور شوہر اس کو کس طرح محسوس کرتے ہیں۔

جناب امین سلونوی نے اسی رنگ کی یہ کتاب اُردو میں لکھی ہے اور بہت خوب لکھی ہے۔ اس سے نہ صرف عورتوں کے زبان کا لطف حاصل ہوتا ہے بلکہ ہمارے معاشرہ میں جو بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں، ان پر بھی طنزیہ انتقاد کیا گیا ہے اور اگر مرد، بیویوں کے طعن و تشنیع سے جن سے انھیں اکثر سابقہ پڑتا ہے، واقعی سبق حاصل کرنا چاہیں، تو اس کے متعلق بھی بڑے لطیف اشارات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔

کتاب بہت دلچسپ ہے اور مطالعہ کے قابل۔ قیمت ۴ عہ۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اُردو، لاہور۔

انوکھا سنسار مجموعہ ہے جناب عشرت رحمانی کے سات ریڈیائی ڈراموں کا۔ عشرت صاحب ریڈیائی نقطۂ نظر سے بڑے تجربہ کار اہل قلم ہیں، کیونکہ برسوں انھیں یہی دیکھتے اور جانچتے گزر گئے ہیں کہ کون ڈراما کس طرح نشر کئے جانے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ خود ان کے لکھے ہوئے ڈرامے ریڈیو کے لئے کتنے معیاری اور موزوں ہوں گے۔

چونکہ عشرت صاحب ریڈیو کے تعلق سے پہلے بھی ادیب و صحافی کی حیثیت سے اپنی جگہ ملک میں پیدا کر چکے تھے، اس لئے ان ڈراموں میں بہت کچھ نہیں، تو تھوڑا سا حصہ اس ادبی دور کا بھی شامل ہے، جو یوں بھی انھیں کامیاب بنا سکتا تھا۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: شمع بک ڈپو۔ پھاٹک حبش خاں۔ دہلی۔

اشتراکی روس ترجمہ ہے ہیولٹ جانسن کی کتاب کا جس میں اس نے بتایا ہے کہ روس کے اشتراکی نظام معاشرت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں لوگوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔

روس کا معاشرتی نظام اس وقت دُنیا کا بالکل نیا نظام ہے جس کا اس وقت تک کہیں اور تجربہ نہیں کیا گیا اور اس نظام کی بنیاد اس باہمی امداد و تعاون پر قایم ہے جسے اس وقت تک نہ مذہب پیدا کر سکا نہ کوئی ملکی قانون۔ چنانچہ اس وقت جب کہ ساری دنیا میں اضطراب برپا ہے وہاں نہ فقر و فاقہ کا سوال ہے، نہ مزدوروں کی بے چینی اور ہڑتالوں کا۔

اس میں شک نہیں کہ روسی نظام کی اس خصوصیت کو ہر ملک اور ہر سوچنے والا دماغ محسوس کر رہا ہے، جس سرمایہ داری، ملوکیت اور شخصی یا جماعتی اقتدار کی طرح گوارا نہیں کرتے کہ اس کا تجربہ کیا جائے اور اس لئے روسی نظام کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں، جن کو فاضل مصنف نے نہایت سادگی و صفائی کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے جن میں سرمایہ داری کے عروج و زوال، زار شاہی دور، صنعتی انقلاب اور اشتراکی نظام وغیرہ تمام مباحث پر نہایت وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔

ترجمہ کلیم اللہ صاحب نے کیا ہے جو مشاق مترجم ہیں اور اس سے قبل کئی کتابوں کا ترجمہ کامیابی کے ساتھ پیش کر چکے ہیں۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ: قومی دارالاشاعت۔ مال۔ لاہور

بزمِ اُخوّت

اغراض و مقاصد: (۱) ایک ایسی بین الاقوامی برادری کا قیام جس میں بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا امتیاز نسل و رنگ بنی نوع انسان کو ایک رشتۂ مودّت میں منسلک کیا جا سکے۔ (۲) ایک ایسی بلند پایہ مجلس کا انعقاد جس میں روایاتی مذہب اور رسمی عقائد و شعائر کے خلاف تمام فرزندان آدم کو ایک اصول کے تحت منظم کیا جا سکے (۳) ایک ایسے رفیع المرتبت ادارے کی تاسیس جس میں انسانیت کے صحیح عناصر کو ایک مرکز پر مجتمع کیا جا سکے۔

اسمائے گرامی ممبرانِ "بزمِ اخوّت"

(۱) اخی المحترم جناب شہریار جنگ بہادر۔ سرفراز منزل برکت پورہ حیدر آباد دکن

(۲) اخی المحترم جناب حسن ناصر صاحب۔ ناصر منزل سورج پول دروازہ اودے پور

(۳) اخی المحترم جناب بخش الٰہی صاحب بذریعہ صادق برادرز ۹۹/۴ پاک موندھا سٹریٹ بمبئی

(۴) اخی المحترم جناب برکت اللہ صاحب۔ انارکلی بٹالہ

(۵) اخی المحترم جناب محمد علی صاحب جنرل ڈیپارٹ سیکرٹریٹ بمبئی

(۶) اخی المحترم جناب عبدالواحد صاحب بذریعہ حافظ ولی محمد صاحب بنگالی بازار ڈاکخانہ گارڈن ریچ ۲۴ کلکتہ

(۷) اخی المحترم جناب محمد عثمان الٰہی بخش صاحب۔ اُردو ٹیچر بیادل مشرقی فائر لیس۔

(۸) اخی المحترم جناب غلام مہدی صاحب شوق۔ مقام خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ۔

(۹) اخی المحترم جناب اسلم کاشمیری ہجویری محلہ چشتی اسٹریٹ لاہور

(۱۰) اخی المحترم جناب سید ارشاد علی صاحب نکہت ہاپوڑی

(۱۱) اخی المحترم جناب ہربھگوان صاحب شاد۔ سیٹھی کاٹج۔ محلہ موہن پورہ۔ راولپنڈی شہر

(۱۲) اخی المحترم جناب اے۔ آر۔ سمتھ صاحب آبکاری روڈ۔ لاہور۔

(۱۳) اخی المحترم جناب محمد علی صاحب اکونٹنٹ محلہ اسلام آباد۔ کوئٹہ

(۱۴) اخی المحترم جناب بابو اسمٰعیل صاحب سپورٹس مرچنٹ میانہ پورہ محلہ سیالکوٹ شہر

(۱۵) اخی المحترم جناب محمد حسن صاحب جنرل مرچنٹ بابو محلہ لائل پور

(۱۶) اخی المحترم جناب منشی نند لال صاحب آنند راجہ بازار راولپنڈی شہر

(۱۷) اخی المحترم جناب ریاض حسین صاحب۔ چٹی شیخان۔ ضلع سیالکوٹ۔

(۱۸) اخی المحترم جناب منشی محمد شفیع صاحب۔ سوداگر چوب شاہ عالمی گیٹ لاہور۔

(نوٹ) بہت سے دوستوں کے نام عدم گنجایش کی وجہ سے رہ گئے ہیں، آیندہ درج کئے جائیں گے۔

قواعد و ضوابط:

ہر وہ شخص اس جماعت کا ممبر ہو سکتا ہے:

(۱) جو بنی نوع انسان سے محبت رکھتا ہو۔

(۲) جو صداقت کا پرستار اور حقایق کا قدر شناس ہو۔

(۳) جس کا نقطۂ نگاہ کورانہ تقلید کی بجائے حق کی تلاش ہو۔

(۴) جس کے دل میں انسانی بہبود اور باہمی رواداری کا جذبہ کارفرما ہو۔

(۵) جو خدا اور بندے کے تعلق کو روایتی مذہب سے ہٹ کر دیکھتا ہو۔

(۶) جو انسانی بہبود کی خاطر شخصی مفاد قربان کر سکتا ہو۔

(۷) بزم کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ ہے یک صد روپیہ یا اس سے زاید رقم یک مشت دینے والے اصحاب اس بزم کے لائف ممبر متصور ہوں گے۔

(نوٹ) بزم کا دستور العمل مع افتتاحی خطبہ از حضرت نیاز فتحپوری مفت طلب کریں۔

پتہ:۔

حکیم اقبال حسن معتمد بزم اخوت

روبرو در یا داتا گنج بخش

لاہور

"زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے"

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ۔ مشکی قوام۔ الائچی دانہ۔ تیل۔ عطر۔ عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ

ٹیلی فون:- ہوڑہ، ۴۵۵

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

خارزارِ سیاست کے لئے خضرِ راہ

یعنی اُردو کا واحد سیاسی ماہنامہ

بانی : ڈاکٹر سید محمود

نئی زندگی

اڈیٹر: سید انیس الرحمٰن

قایم شدہ ۱۹۴۱ء

مصوّر

پڑھا کیجئے، جو محض سیاسیات پر بحث کرتا ہے

مستقل عنوانات :-

(۱) ایڈیٹوریل - جس میں تمام ملکی سیاسیات پر سیر حاصل بحث ہوا کرتی ہے (۲) رفتارِ عالم - جس میں غیر ممالک کی سیاسیات پر دقیقہ رسی سے تبصرہ کیا جاتا ہے۔ (۳) صوبوں کی سیاسیات (۴) اخبارات کی رائیں - یعنی مختلف ملکی رسائل پر ہندوستان کے اخبارات کیا کہتے ہیں (۵) ریاستیں - ریاستوں کے اہم کوائف و حالات (۶) سمندر پار کے ہندوستانی (۷) دارالسلطنت - ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی کی سیاسی سرگرمیاں۔ (۸) سوال و جواب - مشکل سیاسی سوالات کا ادارہ کی طرف سے جواب۔ (۹) معلومات - اہم سیاسی معلومات اعداد و شمار وغیرہ۔ (۱۰) ڈایری - ایک مہینے کی دنیا اور ہندوستان کی سیاسی ڈائری۔ (۱۱) صنعت و حرفت - (۱۲) تبصرے (۱۳) افسانے (۱۴) فلمی تبصرے وغیرہ

ان مستقل عنوانات کے تحت ادارہ کے مخصوص مضامین کے علاوہ ہر مہینے اہم ملکی و غیر ملکی سیاسی مسائل پر ہندوستان کے مفکرین، علماء کرام اور رہنماؤں کے بصیرت افروز مضامین ہوا کرتے ہیں۔ غرضیکہ نئی زندگی ہندوستان و بین الاقوامی سیاسی کوائف کی ایک ماہانہ رپورٹ ہے جس کا مطالعہ موجودہ دور کی پیچیدہ سیاسیات کو سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔

علاوہ ازیں ہر مہینے سیاسی سرگرمیوں کی بہترین تصاویر

سالانہ چندہ سے، ششماہی ہے، نمونہ کے لئے ۸ر آنہ کے ٹکٹ ممالک غیر سے ۱۴ شلنگ

منیجر ماہنامہ "نئی زندگی" ۹۰ ہیوٹ روڈ الہ آباد

"نئی زندگی" کا مطالعہ آپ کو انگریزی سے بے نیاز کر دیگا

پیش کش ادارہ نگار

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

طالب الہاشمی لکھنؤ

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ مادیئن کا مذہب

۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے [illegible] اور انشاء کے لحاظ سے بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولانا نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص ہاتھ کی ساخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و ننگ، نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً۔ مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے

رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۶۶

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۴ء

(جدید شاعری نمبر)

اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا وزن و قافیہ سے بے نیاز ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء

(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر اسٹڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترخانۂ جرأت استہتار

ایک سال چھ ماہ تین ماہ ایک ماہ

ایک صفحہ ۲۰ روپیہ ۱۲ روپیہ ۷ روپیہ ۲ روپیہ

آدھ صفحہ ۱۲ روپیہ ۷ روپیہ ۴ روپیہ ۱ روپیہ

چوتھائی صفحہ ۷ روپیہ ۴ روپیہ ۲ روپیہ ۱ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ

ششماہی جاری نہیں ہو سکتا

سالانہ بیرون ہند دس روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ ار تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ ار تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ منیجر

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے